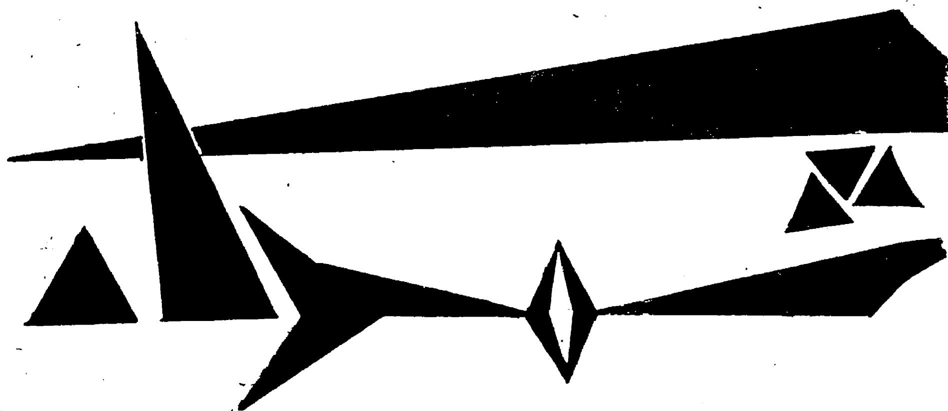
رؤف خیر



بار : اوّل

سنِ اشاعت : جولائی ۱۹۹۳ء

تعداد : ایک ہزار

کتابت : یوسف رضا

طباعت : اسپیڈ پرنٹس، آفسیٹ پرنٹرس اینڈ بائنڈرس

۷/۸۳۶-۲-۱۶۔ "رحمت کدہ" نزد فرح کالونی، سعید آباد، حیدرآباد 500659

قیمت : چالیس روپے

ناشر : خیری پبلی کیشنز، "بیت الخیر" (۹-۱۰-۲۰۲/۱۹) دلاور شاہ نگر رسالہ بازار، گولکنڈہ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۸

مرتبین : ایلاف خیری، عقیف خیری، عطوف خیری، تنظیف خیری رافف خیری، ہاتف خیری، تالیف خیری

کتاب ملنے کے پتے :

۱۔ شب خون کتاب گھر ۔ ۳۱۳ ۔ رانی منڈی، الہ آباد ۔ ۳

۲۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

۳۔ مکتبۂ قصر الادب، پوسٹ بکس ۵۲۶۲، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

۴۔ حدیث پبلی کیشنز، ۱۵۹ ۔ اے پی آئی آئی سی کالونی، حیدرآباد ۵۰۰۰۶۲

یہ کتاب اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی

انتساب

خوب صورت و خوب سیرت بیٹی

عفیفا خیری

کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

رؤف خیر ۵ پانچ نومبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی۔ اب اردو کے لیکچرر ہیں۔ ان کی ایک نظم "جب میں اسکول جانے لگتا ہوں"، حکومت مہاراشٹر نے چوتھی جماعت کے نصاب میں شامل کر رکھی ہے۔ ایک اور نظم "ہمالہ" کو حکومت آندھرا پردیش نے دوسری جماعت کے نصاب میں شامل کیا ہے۔ آپ کا کلام آل انڈیا ریڈیو دہلی، عالمی سروس، بمبئی، کلکتہ، بھوپال اور حیدرآباد سے نشر ہوتا رہتا ہے۔ ٹی وی پر بھی آپ نے انھیں دیکھا ہوگا۔ کل ہند اور ہند و پاک مشاعروں کے بہانے رؤف خیر نے ہندوستان کے کئی اہم شہر دیکھ ڈالے۔

ان کے پچھلے دونوں مجموعے "اقراء" اور "ایلاف" تقریباً نایاب ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان مجموعوں سے چند تخلیقات منتخب کر کے ہم نے "شہداب" میں شامل کرلیں تاکہ آپ کے ذوق کی بہتر پذیرائی ہو سکے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری مرحوم نے "اقراء" پر "خدا لگتی" کے عنوان سے "بلٹز" میں جو تبصرہ کیا تھا، وہ ان کی کتاب "کتاب شناسی" میں بھی شامل ہے۔ یہ تبصرہ ایک ایسے ناقد نے کیا تھا جو رؤف خیر کو بالکل نہیں جانتا تھا اور جس نے رؤف خیر کو ان کے شعر کے حوالے سے پہچانا تھا۔ ہم نے "شہداب" میں اس تبصرہ کو شامل کرلیا ہے۔

محترم شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے بھی رؤف خیر کے لئے ایک سند کا درجہ رکھتی ہے کہ حق گوئی و بے باکی میں ان کا ثانی کوئی نہیں۔ اس کتاب کو منظر عام پر لانے میں اردو اکیڈمی کا جزوی تعاون بھی گھر کی تعمیر میں زمین کی فراہمی کے مترادف ہے۔ ناسپاس گزاری ہوگی اگر ہم اپنے کرم فرما مصلح الدین سعدی کا شکریہ ادا نہ کریں جن کا خلوص ہمیشہ ہمارے شاملِ حال رہا۔

اب "شہداب" پڑھیئے اور اپنی رائے سے نوازیئے کہ آپ کی رائے ہمارا حوصلہ بڑھائے گی۔

شمس الرحمن فاروقی

رؤف خیر کا مداح میں ایک زمانے سے ہوں۔ پھر جب جدیدیت کا بازار گرم ہوا تو وہ شعراء جن کا رنگِ کلام اور طرزِ فکر گویا از خود اس نئے لہجہ و آہنگ کا نمونہ ٹھیرا، اُن میں رؤف خیر بھی تھے۔ لیکن بہت سے دوسرے نئے شعراء کی طرح انہوں نے جدیدیت کی گرمیِ بازار سے فائدہ اٹھا کر دھڑا دھڑ مجموعہ کلام کی بارش نہیں کر دی بلکہ سوچ سوچ کر کہتے رہے، اپنے کلام کو اپنی ہی تنقیدی نظر سے پرکھتے رہے، فن کے پُرانے اسالیب کو بھی صحیح تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس بنا پر ان کا پہلا مجموعہ "اقراء" (۱۹۷۷ء) نظرِ نقاد پر دیر میں سامنے آیا لیکن کلام کی صلابت اور لہجے کے اعتماد کی بنا پر اسے بہت جلد جدید شاعری کے عمدہ نمونوں میں شمار کر لیا گیا۔ یہی عالم رؤف خیر کے دوسرے مجموعہ "ایلاف" (۱۹۸۲ء) کا تھا۔ اس وقت تک رؤف خیر کی حیثیت نئے شعراء کی محفل میں پوری طرح مستحکم ہو چکی تھی۔

اب جو رؤف خیر کا تیسرا مجموعہ "شہداب" آپ کے ہاتھوں میں ہے تو مجھے ایک تازہ مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نویں اور دسویں دہائی کے شعراء کچھ بھی کہیں، لیکن ساتویں دہائی کے شعراء نے زندگی کو برتنے اور اسے شعر میں بالواسطہ طور پر سمونے کا جو ڈھنگ دریافت کیا تھا، وہ آج بھی سکۂ رائج الوقت ہے، اور آج کے کسی شاعر کو رؤف خیر جیسے شاعر سے معاملہ کئے بغیر چارہ نہیں۔

رؤف خیر نے زندگی کو ایک ایسے شخص کی طرح دیکھا ہے جو اچانک کسی محفل میں بٹھا دیا گیا ہو، لیکن اس محفل کے آداب اور اس کی زبان سے وہ نابلد ہو۔ کوشش کے باوجود نووارد کو ایسی محفل تھوڑی بہت معاند، تھوڑی بہت نامفہوم اور تھوڑی بہت ناقابلِ برداشت لگے گی۔ معاندت اور نامفہومی کے تجربے کو رؤف خیر نے کہیں بھائی بھائی کی مغائرت،

کہیں گزشتہ شعری اسالیب سے انکار، کہیں سرکس کے جانوروں کی قید بامشقت کے استعاروں سے ظاہر کیا ہے۔

رؤف خیر نے استعارہ اور علامت پر نظم کی بنیاد رکھنے کی بجائے پوری نظم کو استعارہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

غزلوں میں رؤف خیر اپنے لہجے کی بنا پر پہچانے جاتے ہیں۔ اس لہجے میں شدّت اور کسی بات کو بڑے یقین یا زور سے کہنے کی کوشش کے بجائے ایک ایسی خاموش، بظاہر پُرسکون لیکن بباطن گونجتی ہوئی روح کی لاتعلقی کی زبان استعمال ہوئی ہے جو خود ترحمی، گریہ و بکا اور آہ و فغاں کے بجائے ٹھنڈی، تقریباً لاشخصی اور حکیمانہ ہے۔ لیکن اس میں مربیانہ رنگ نہیں کیوں کہ ان غزلوں کا متکلم خود کو آپ ہی کی سطح پر رکھ کر گفتگو کرتا ہے۔

"شہداب" نہایت عمدہ مجموعہ ہے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

(نئی دہلی - ۱۲ر جون ۱۹۹۳ء)

ظ۔ انصاری

حیدر آباد کے رؤف خیر کا شعری مجموعہ کھولا تو ایسا معلوم ہوا کہ گیلی لکڑیوں کی ٹال پر جو ایندھن تُلوایا تھا اس میں صندل کی ٹہنی بھی چلی آئی ہے۔ مہکتی ہوئی۔
شاعر نے پُشت کے سرورق پر اپنا فوٹو چھاپ دیا۔ حالات نہ لکھے۔ اگرچہ شعر کو تولتے وقت شاعر کی زندگی سے جانکاری لازم نہیں، تاہم اس سے کچھ روشنی مل جاتی ہے۔ بعض اوقات کسی نظم یا شعر کی اہمیت خود شاعر کے اعمالنامے سے وابستہ ہوتی ہے۔
یہ پتلا سا ۱۲۰ صفحے کا مجموعہ قرآن کے سورۂ عَلَق (اقرأ باسم ربک) سے اور اس کے بعد نعت سے شروع ہوتا ہے اور تمام ہوتا ہے "ترائیلے" (صنف سخن) پر جسے اُردو میں وارد ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں گزرے۔ آخری ترائیلے اپنے اکلوتے بھائی کے نام ہے۔ عنوان "دیوار"۔

ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح
اتنا بودا تو نہ تھا خون کا رشتہ اپنا
ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
اپنی اپنی ہے خوشی، درد ہے اپنا اپنا
ہم ہوئے شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح
ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح

مگر یہاں مشاہدوں کے تحفے اس طرح بکھرے پڑے ہیں کہ ہمیں شاعر کا احوال جاننے سے بے نیاز کردیتے ہیں۔ غزلیں، نظمیں، آزاد، پابند نظمیں، سانیٹ، ترائیلے، یہاں سب رنگ ہیں اور سب میں الگ الگ قسم کی تازگی۔ زندگی سے شاعر کے برتاؤ کی جھلکیاں۔ وہ نہیں جیسے استادانِ سخن اپنا دیوان مرتب کرتے وقت اگر دیکھتے کہ حروفِ تہجی میں کوئی ایک آدھ حرف ردیف قافیہ میں بندھنے سے رہ گیا تو اس حرف کے نام کی بھی غزل لکھ لکھا کر دیوان میں ڈال دیا کرتے تھے کہ گڈھا نہ رہ جائے۔

رؤف خیر نے جہاں تک نظر گئی حسن اور درد کے نام سے آنچ لی ہے۔ پڑوسی کے چولھے سے نہیں مانگی۔ کچی مشق کے باوجود وہ سچے شاعر ہیں۔ پہلی ہی غزل کا مطلع ہے:

ابھی نگاہ کو پیغمبرانہ ہونا ہے
کہ فلسفوں کو ابھی عامیانہ ہونا ہے

یہاں عامیانہ کا لفظ غالباً عام فہم کے معنی میں آیا ہے اور "ابھی" کی تکرار بھی کچھ خوشگوار نہیں۔ ان دونوں کوتاہیوں کے باوجود اس تصور کی رینج ایسی زبردست، فلسفہ اور پیغمبری کے رشتے پر ایسی خیال انگیز اور دوٹوک کمنٹری ہے کہ شعر بیک وقت دل و دماغ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اور کیا سادہ مقطع ہے:

رؤف خیر چلو یہ بھی اب غنیمت ہے
بھلائی کہتے ہیں جس کو برا نہ ہونا ہے

اساتذہ کی نظر میں پہلے مصرعہ کو یہاں "ہے" پر ختم نہ ہونا چاہیے۔ یہ تب بھی عیب تھا اور اب بھی عیب ہے۔ مگر شعر کیسا ہے؟ — ہے نا سچا۔؟

پوری غزل دی جائے تو شاعری کی اونچ نیچ کھلے:

تجھ کو پالینے سے بہتر ہے ترا کھو جانا　　آج انتا مرا مایوسِ وفا ہو جانا
جب کوئی زخم ہتھیلی پہ لگا تو جانا　　ہائے کیا چیز ہے پابندِ حنا ہو جانا
آج تک بھی وہی دیوانہ ادا باقی ہے　　گھر سے نکلے تو تری راہ گزر کو جانا
خشک لمحوں کے ہیں مارے ہوئے ہم لوگ ہمیں　　رات بھیگے تو ضروری تو نہیں سو جانا
تو پشیمان نہ ہو، ہم نے بھی یہ سوچا ہے　　داغ ناکردہ گناہی کے ہیں، کیا دھو جانا
کون پھر بھیڑ میں کیا جانے کہاں رہ جائے　　آؤ فرصت ہے ابھی، خاک اڑا لو، جانا

آج سونی ہیں بہت دیر و حرم کی راہیں　　اس طرف ہو کے ذرا بادہ گسارو جانا
خیرؔ آنکھوں کے تہی کاسے لئے پھرتا ہے　　اور کس چیز کو کہتے ہیں لہو رو جانا

ہم عصر عزیزوں کو "غالب پسندوں" سے چڑ ہو گئی ہے کہ وہ غالب کے پھیر میں پڑے ہیں اور اپنے زمانے کے اُبھرتے ہوئے "غالبوں" کو خاطر میں نہیں لاتے۔ سلیمان اریب (مرحوم)، محمد علوی رفعت سروش، عبداللہ کمال، سب کے ہاں ایک آدھ چھینٹا ادھر بھی پڑتا ہے۔ بعضے تو غالب پر ہی غرّانے لگتے ہیں۔ مگر معقولیت کا شکوہ وہ ہے جو رؤف خیرؔ نے کیا؛ سانیٹ ہے "نذرِ غالب"

محرّف ہو چکیں تورات کی سب آیتیں بھائی
نئے پیغمبروں پر اب نئے سورے اُترتے ہیں
جو اپنے دور کے معیار پر پورے اترتے ہیں
نئے معنی دکھاتی ہے نئے لفظوں کی رعنائی

نئی دھوپوں میں پچھلی رات کے سب خواب زرد آئے
مسائل نور کی ہر بوند پی لینے کے عادی ہیں
اِدھر ہم بھی نئے سورج اُگا دینے کے عادی ہیں
کہ ہم ڈرتے ہیں اپنے قد سے بڑھ جائیں نہ یہ سائے

غلط ہے یہ کہ ہم ماضی کی تصویروں سے چڑتے ہیں
مگر یہ سچ ہے اپنا درد، اپنا درد ہوتا ہے
ترے لہجے میں اپنا غم سمونا ایک دھوکا ہے
نئے لوح و قلم پیچیدہ تحریروں سے چڑتے ہیں

تو اپنے دور کی آواز تھا، یہ مانتے ہیں ہم
مگر جو غم ہے اپنے دور کا، پہچانتے ہیں ہم

("کتاب شناسی"۔ "اردو بلٹز" بمبئی، ۳۰ ستمبر ۱۹۷۸ء)

دُعائیہ

آنکھ جب دی ہے تو اس درجہ کی بینائی دے
میں جسے دیکھنا چاہوں وہی دکھلائی دے

میرے آئینے کو بے پارہ مزاجی سے بچا
مجھ کو خود رائی نہیں بلکہ خود آرائی دے

میں کہاں اور کہاں دعویٔ ثابت قدمی
لاج رکھ لے مری، رستہ مجھے بے کائی دے

کیا کروں لے کے مہ و مہر زوال آمادہ
جہدِ مور اور مگس کی مجھے صناعی دے

رشتۂ فکر سے بڑھ کر نہیں خوں کا رشتہ
مجھ کو انصار و مہاجر سا کوئی بھائی دے

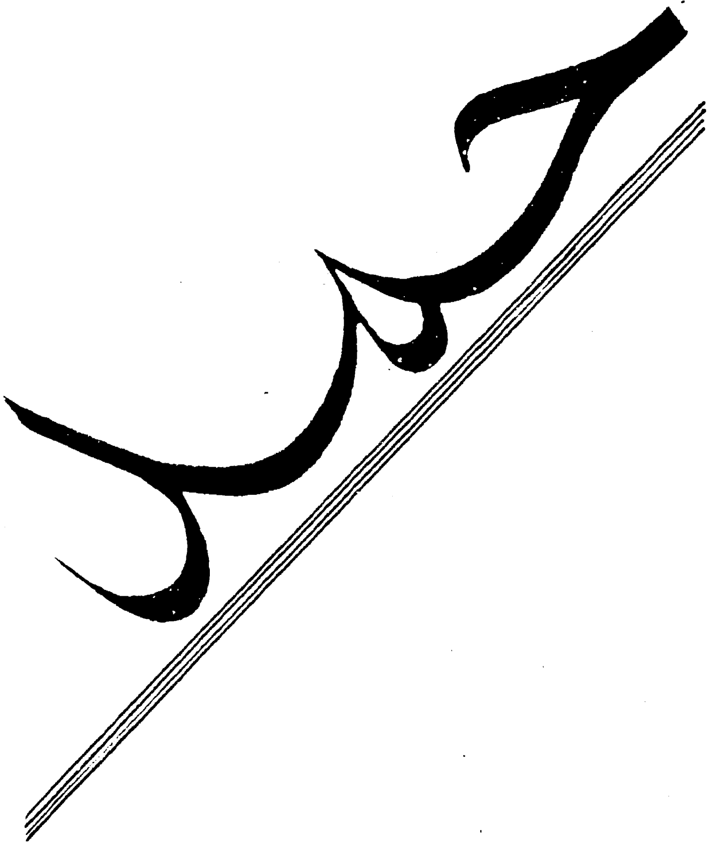
دوستوں کو مرے نادانی کی ذلت سے بچا
دینے والے مجھے دشمن کی بھی دانائی دے

آنکھ جھک جائے نہ دے آنکھ کو منظر ایسا
دل ہی بھر آئے کچھ اتنی بھی نہ تنہائی دے

ہار جانے میں کوئی عار نہیں ہے مجھ کو
آپ اپنے ہی مقابل مجھے پسپائی دے

ہر بتِ خاک دبتِ پاک سے بیزار ہوں میں
اس جبیں کو کسی در کی نہ جبیں سائی دے

سخت و سنگین زمینوں کو نمو رنگ بھی کر
خیرؔ کے حرفِ شگفتہ کو پذیرائی دے



لگا حرف ہر اک سُبک تر خدایا
کروں حمد تیری میں کیوں کر خدایا

ترے لئے ہے شہنشاہوں کی شہنشاہی
کسی کو زیب نہیں دیتا راج تیرے سِوا

یہ کون ہے جو جٹائی بھی چھین لیتا ہے
یہ کون بھیک میں دیتا ہے تاج تیرے سِوا

شفا تو ہاتھ تیرے ہے، کون کرتا ہے
جو لاعلاج ہیں، ان کا علاج تیرے سِوا

ترے سوائے بھلا کل بھی کون تھا اپنا
جہاں میں کون ہمارا ہے آج تیرے سِوا

وہ سر ہے جس میں بھرا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
اِدھر اُدھر نہ جھکا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
تمام علم کے دروازے اس پہ بند ہوئے
کہ جس پہ کھل نہ سکا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
ہمارا کفر بھی ایمان کا تقاضہ ہے
تبھی تو ہم نے کہا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
بنے ہوئے ہیں خدا نفس و آل و مال و متاع
مگر یہ سر نہ جھکا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
خوشی آئے گا نہ کوئی اور ذائقہ اس کو
زباں پہ جس کی رہا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
ہمارے ہاتھ میں چابی ہے اسمِ اعظم کی
وہ کوئی در ہو، کھلا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
اِدھر اُدھر کو بھٹکتی نہیں نظر اپنی
رہا ہی دیدنی کیا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
قدم قدم پہ تراشے کئی خدا اس نے
زباں سے کہتا رہا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
ہمیں تو خیر خداؤں نے گھیر رکھا تھا
مگر جو ہم نے کہا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
رؤف خیر مقفل تو کوئی در نہ رہا
ہنر وہ ہاتھ میں تھا لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ

میں حاجت مند ہوں حاجت روا تو — مرا مولا، مرا مشکل کشا تو
بھلا کیسے کسی سے جا کے مانگوں — کہ تو کہتا ہے میرے پاس آ تو
چلوں گر اک قدم تیری طرف میں — تو میرے پاس آئے بھاگتا تو
کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے — مسیحا تو دواؤں میں شفاء تو
بھلا کوئی بچا سکتا بھنور سے — ہمارا ناخدا بھی ہے خدا تو
تری درگاہ میں بے بس پیمبر — ڈبو دیتا ہے بیٹا نوحؑ کا تو
محمدؐ نے کہا بیٹی سے اپنی — عمل کر تو عمل کر فاطمہ تو
تجھی کو المدد کا لفظ زیبا — جہاں تجھ کو پکارا آگیا تو
ضرورت کیا وسیلے کی کسی کے — کہ ہے نزدیک شہ رگ سے سدا تو
کوئی دیتا نہیں تیرے سوائے — سبھی بے کس غنی الاغنیاء تو
توہی بندہ نواز و بندہ پرور — توہی مولائے کل غوث الوریٰ تو

جو اپنا جائزہ لیتا نہیں ہے
دکھا دیتا ہے اس کو آئینہ تو

آپ اپنے کو ٹٹولا تو یہ قصّہ دیکھا
ایک اک حس پہ مکمل ترا قبضہ دیکھا

کوئی پردہ نہ علاقہ ہے نہ حد اس کے لئے
چشمِ بینا نے عجب دیکھنے والا دیکھا

سُننے والا ہے سدا اوّل و آخر تو ہی
سُننے والا نہ کوئی تیرے عُلاوہ دیکھا

چار سو پھیلی ہوئی ہے تو ہے خوشبو تیری
چار سو چھایا ہوا تیرا سراپا دیکھا

ذائقہ تیرا کبھی تیرے نمک خواروں سے
چھوٹنا ہی نہیں چسکا ہی کچھ ایسا دیکھا

کون ہے تیرے سوا ہاتھ پکڑنے والا
دستگیری کو ہمیشہ تجھے آتا دیکھا

تو کوئی روپ نہ بہروپ کوئی رکھتا ہے
تو تو وہ ہے کہ ترا باپ نہ بیٹا دیکھا

خیر ہر در میں معیارِ حقیقت ہے جہاں
شر پسندوں کا وہیں رنگ بھی اڑتا دیکھا

در اصل اک ذرۂ بے مایہ ہوں صحرا تو ہے
سچ تو یہ ہے تشنۂ شہداب ہوں دریا تو ہے

ہر چند کہ بُت شکنی میں ہوں کفِ ابراہیم
ٹوٹ نہ سکے چاہوں جسے کچھ دو دست ہی ایسا تو ہے

محور ہی ورنہ تھا نمایاں نہ مدارِ پرکار
تکمیل و تشکیل میں لیتا ہے جو حصّہ تو ہے

میری مجال اتنی کہاں منہ ترے آگے کھولوں
اتنا پتہ ہے کہ مرے سامنے گویا تو ہے

اب میری پہچان میں شامل تری پہچان بھی ہے
دے قامتِ زیبا کہ پھر آئینے جیسا تو ہے

اے خالقِ مور و مگس صاحب کل ارض و سما
گم کردہ راہوں کا فقط ملجا و ماوی تو ہے

حمدِ تعالیٰ میں تو شعر ایک سلیقہ کا نہیں
کھل ہی گیا خیر بہت بولنے والا تو ہے

٭ غیر متداول بحر میں



کوئی لکیر نہیں اس لکیر سے بہتر
ہنر یہ ہے کہ ہمارے ہنر میں بھی تم ہو

اعترافِ عجز

میں نعت کہہ سکوں یہ مری کیا بساط ہے
عاجز بڑے بڑے ہیں سخنورِ رسولِ پاکؐ
ممکن نہیں ادا بھی ہو ماں باپ ہی کا حق
حق آپؐ کا ادا ہو تو کیونکر رسولِ پاکؐ
قربان میری جاں مرے ماں باپ آپؐ پر
قربان آپؐ پہ مرا گھر بھر رسولِ پاکؐ

جس میں نہیں ہیں آپؐ سراسر رسولِ پاکؐ
وہ آئینہ نہیں ہے برابر رسولِ پاکؐ

میرے لئے تو پیڑ ہرا بھی گھنا بھی آپؐ
میرا مکاں ہے دھوپ کے رخ پر رسولِ پاکؐ

گیلی ہے میری خاک تو گردش میں چاک ہے
پیکر میں ڈھالئے مجھے چھو کر رسولِ پاکؐ

دل میں اتر کے رہ گیا اترا جو آپؐ پر
اب کیا پڑھیں صحیفۂ دیگر رسولِ پاکؐ

پیاسے لبوں کو آپؐ سے دو گھونٹ کیا ملے
جچتا نہیں ہے کوئی سمندر رسولِ پاکؐ

میں آپؐ کے بغیر ادھورا تھا ہر جگہ
پورا ہوا ہوں آپؐ سے مل کر رسولِ پاکؐ

ہم وہ غلام بیعت و نسبت ہے آپؐ سے
ہم خاک چھانتے نہیں در در رسولِ پاکؐ

چلنے لگا ہوں آپ کی انگلی جو تھام کر
گم ہو سکوں گا بھیڑ میں کیوں کر رسولِ پاکؐ

کب خیبرؔ مہر و ماہ کے سکوں میں بک سکا
قیمت لگا چکا ہے بہت شر رسولِ پاکؐ

کیا تھا کس نے گھنی تیرگی کو رد کہیئے
اس آدمی نے جسے نورِ مستند کہیئے

اسی کی آنکھ میں تھا شامِ بے چراغ کا درد
وہ صبح جس پہ نثارِ آفتاب صد کہیئے

زمیں کو بخش دیئے اس نے آسمان کے راز
اب اور رہ گئی کیا جستجو کی حد کہیئے

کوئی شعورِ حیات اس سے گر نہیں لیتا
اسے شعورِ نظر ہی سے نابلد کہیئے

وہ نیک خو کہ بھلا چاہتا رہا سب کا
تڑپ کے رہ گئی کیا کیا نگاہِ بد کہیئے

وہ جس کی راہ میں حائل نہ ہو سکے بونے
اسے شعورِ مکمل "نگاہِ قد" کہیئے

ملیں گے یوں تو کئی راستے میں چور لٹیرے
جو اس کی راہ نہیں راہِ مسترد کہیئے

ہزار کوششیں کر لی ہیں خاک زادوں نے
کہیں پڑی ہے سمندر پہ کوئی زد کہیئے

صدائے خیر سنیں طالبانِ منزلِ نور
قدم اکھڑنے لگے ہوں تو المدد[1] کہیئے

---

[1] المدد کا لفظ صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں میری بھی یہی مراد ہے۔ خیر

ملتے نہیں حروف ہی شایانِ مصطفےٰ
لاؤں کہاں سے لہجۂ حسّانِ مصطفےٰ

ایک ایک حرف ہے ادبستانِ مصطفےٰ
اہلِ زباں ٹھہرے زباں دانِ مصطفےٰ

شاہد ہے حرف حرف کہ شاعر نہیں ہیں آپؐ
پھر بھی صحاحِ ستّہ ہیں دیوانِ مصطفےٰ

ساحر نہیں ہیں آپؐ یہ ایمان ہے مرا
شق القمر ہے معجزہ و شانِ مصطفےٰ

کاہن نہیں ہیں آپؐ یہ دنیا گواہ ہے
لیکن ہوا وہی جو تھا فرمانِ مصطفےٰ

اللہ کی زبان، زبانِ رسول ہے
اللہ کا کلام ہے فرمانِ مصطفےٰ

دیکھا گیا کہ دیدہ و دل پر ہیں حکمراں
شاہوں سے بھی سوا ہیں غلامانِ مصطفےٰ

درویش کی متاع تو ہے قلبِ مطمئن
ہے بے نیاز بے سرو سامانِ مصطفےٰ

اک آفتابِ رشد و ہدایت ہے در بغل
وہ سینۂ صفا ہے کہ جزدانِ مصطفےٰ

ٹھہری ہے علم سینہ بہ سینہ ہی کتاب
اس کے سوائے کچھ نہیں فرمانِ مصطفےٰ

اب کیا کسی کے ہاتھ پہ بیعت کریں گے ہم
ہم نے تو کی ہے بیعتِ رضوانِ مصطفےٰ

تلتا نہیں ہے اس میں کسی کا حسب نسب
میزانِ مصطفےٰ ہے یہ میزانِ مصطفےٰ

گردن جھکی ہوئی ہے تو آواز پست ہے
اٹھتا نہیں ہے خیر سے احسانِ مصطفےٰ

جتنے رستے ہیں سب پُر خطر مصطفےٰ
آپ کی رہ گزر رہ گزر مصطفےٰ

وار دی جان بھی آپ پر مصطفےٰ
اب عُمر ہو گئے ہیں عمرؓ مصطفےٰ

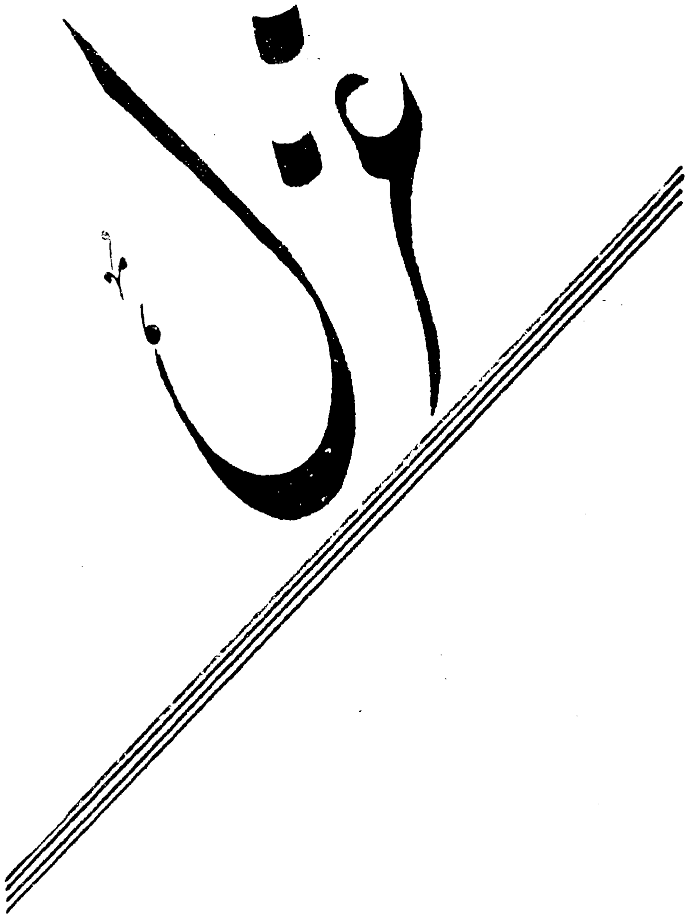
سب کھرے اور کھوٹے کی پہچان دی
آپؐ نے دی ہمیں وہ نظر مصطفےٰ

آنکھ پر بوجھ تھے ٹمٹماتے دیئے
آپؐ آئے تو آئی سحر مصطفےٰ

ہے مدینہ اِدھر اور کعبہ اُدھر
ہے اِدھر گھر اُدھر مستقر مصطفےٰ

ڈھل گئے چاند تاروں میں ذرّے کئی
بے خبر جب ہوئے باخبر مصطفےٰ

آپؐ کا ساتھ ہے خیر ہی خیر ہے
اب کہاں شر کا کوئی گزر مصطفےٰ



کوئی خدائے سخن کوئی خاتم الشعراءِ
تو خیر کیا مرے حرفِ ہنر میں خاک نہیں؟

کونپل بھی تخریب کی پھوٹی ہے دیکھو تعمیر کے پاس
کیسے بچھو رینگ رہے ہیں پُرکھوں کی جاگیر کے پاس

بھاگ متی کی یاد آئی ہے قلی قطب کی گنبد میں
اپنا نام بھی لکھا دیکھا جب تیری تحریر کے پاس

جب سے تو نے اس پانی سے اپنا ناتا توڑ لیا
میں بنجارہ پیاسا پیاسا بیٹھا ہوں مانیر[1] کے پاس

[1] کریم نگر (آندھرا پردیش) کی ایک ندی کا نام

جو تیرے نام نہیں وہ مری عبارت کیا
تجھے نہ دیکھ سکوں تو مری بصارت کیا

میں ایک خشت سہی جذب ہوں ترے اندر
مرے وجود سے ہٹ کر تری عمارت کیا

قلم میں ہاتھ تو حرفِ ہزار معنی ہم
رہے گی اب تری دیوار بے عبارت کیا

مہاجرین سے انصار خوش نہیں ہوتے
تو پھر کہاں کی یہ ہجرت برائے ہجارت کیا

عذاب ہو گئیں راتیں خراب ہو گئے دن
ترے بغیر کوئی خواب کیا بشارت کیا

تباہ ہو گئے خیمے چراغ ہو گئے گل
ہوا کرے گی بھلا اور اب شرارت کیا

رگوں میں خون اچھلتا ہے تو بہتر ہے
یہ رکھ رکھاؤ بس اندازیِ حرارت کیا

خوشی یہ ہے کہ تری دسترس میں ہوں یوں بھی
مری اڑان ہی کتنی مری جسارت کیا

اُسے خرید لیا خود کو بیچ کر ہم نے
ہے اور اس سے زیادہ بڑی تجارت کیا

رہیں گے ہم کسی صورت نہیں کہیں نہ کہیں
کرے گی خیر یہ مٹی ہمیں اکارت کیا



سحر کو بادِ صبا نے مجھے بکھیر دیا
میں اپنی خاک سنبھالے ہوئے تو رات سے تھا

بچا ہوا سے تو دھوپوں کی زد میں آ کے گرا
وہ برگِ سبز جو موسم کی باقیات سے تھا

وہ مر گیا تو خدا ہو گیا ہزاروں کا
وہ شخص اپنے ہی جیسا تھا جب حیات سے تھا

وہ بات اور ہی ہے جو تمہیں سنانا ہے
سخنوری تو مری بات کا بہانا ہے
جو ایک دیو تھا سرکس کا شیر ٹھیرا ہے
ہوا کے ہاتھ میں یہ کیسا تازیانہ ہے
ہمیں سنبھال کہ ہیں شاہکارِ کوزہ گری
ہماری خاک تری آگ سے توانا ہے
کوئی نشان لگاتے چلو درختوں پر
کہ اس سفر سے تمہیں لوٹ کر بھی آنا ہے
چلے جو ہم تو کسی نے وداع بھی نہ کیا
ملال یہ کہ ہمارا سفر سہانا ہے
سدا بہار ہے اس کے سخن کی ہریالی
وہ میرے واسطے موسم نہیں زمانہ ہے
مجھے تو چھوڑ کم از کم سنبھال تو خود کو
میں بے ٹھکانہ سہی کچھ ترا ٹھکانا ہے
غزل تو جیسی بھی کہتا ہے وہ تو ظاہر ہے
رؤف خیر کا لہجہ بھی شاعرانہ ہے

اب اسقدر بھی تو خانہ خراب ہم نہ ہوئے
ملال یہ ہے تمہیں دستیاب ہم نہ ہوئے

کتاب ہم نہ ہوئے انتساب ہم نہ ہوئے
ترے لیئے نگہِ انتخاب ہم نہ ہوئے

ہمیں قریب سے دیکھو کہ دور سے دیکھو
کبھی کسی کے لیئے بھی سراب ہم نہ ہوئے

ہمارا عشق تو سچا تھا عمر کچی تھی
ہزار سیل تھا غرقِ چناب ہم نہ ہوئے

ہماری راہ میں روڑے خرد نے اٹکائے
قدم قدم پہ جنوں اجتناب ہم نہ ہوئے

اسی ملال میں آٹھوں پہر برستے ہیں
اس ایک دشت کے حق میں سحاب ہم نہ ہوئے

ہنر ہی ایسا ہے چمگادڑوں پہ کیا کھلتا
رؤف خیر چلو آفتاب ہم نہ ہوئے

عجیب درد اٹھا لائے داغ کے بدلے
نیا چراغ پرانے چراغ کے بدلے

پتہ نہیں یہ امیری ہے یا غریبی ہے
اُسے نصیب ہے سب کچھ فراغ کے بدلے

ہمیں یہ علم ہے کس حرف کو کہاں برتیں
دماغ رکھ نہیں دیتے ایاغ کے بدلے

یہ مانا ہوگا پہاڑوں کے اس طرف سب کچھ
بُرا ہی کیا ہے یہ گھر سبز باغ کے بدلے

ہر ایک بات مدلّل نہیں ہوا کرتی
کبھی تو دل کی بھی سُن لو دماغ کے بدلے

وہ رات کٹ گئی اس کو تو خیر کٹنا تھا
اب آفتاب سنبھالو چراغ کے بدلے

سب پتے تمام حلقۂ صرصر میں رہ گئے
ہم شاخِ سبز میں شجرِ تر میں رہ گئے

گھر کر چکا ہم سپاہ سکندر میں رہ گئے
ہاتھی ہمارے اپنے ہی لشکر میں رہ گئے

لکھ لیا اسقدر وہ سفینے نہیں مرے
ساحل پہ رہ گئے جو سمندر میں رہ گئے

آثارِ یک خرابہ آباد ہو کے ہم
سینوں میں رہ نہ پائے تو پتھر میں رہ گئے

اس لذتِ سفر کو میں اب ان سے کیا کہوں
جو سایہ ہائے سرو صنوبر میں رہ گئے

باہر ہی چھوڑ آئے وہ چہرہ جو خاص تھا
اک عام آدمی کی طرح گھر میں رہ گئے

تم تو آنا کا ایک جزیرہ ہو، سوچ لو
ایسے کئی جزیرے سمندر میں رہ گئے

رسوا انھیں بدن کے تقاضوں نے کر دیا
کیا لوگ تھے کہ ٹوٹ کے پل بھر میں رہ گئے

ابھی نگاہ کو پیغمبرانہ ہونا ہے
کہ فلسفوں کو ابھی عامیانہ ہونا ہے

میں ایک پودا ہوں ملبے میں سانس لیتا ہوا
کہ اس کھنڈر میں مجھے بھی خزانہ ہونا ہے

عجب پرندہ ہے ہر زد سے بچ نکلتا ہے
پتہ نہیں اسے کس کا نشانہ ہونا ہے

ہمیں اندھیرا ہیں یہ طے ہے آپ سورج ہیں
ہمارا ہوتا مگر آپ کا نہ ہوتا ہے

میں چپ نہیں ہوں کہ اس دورِ ابتلا میں مجھے
حریفِ خامشیِ مجرمانہ ہونا ہے

بھلا دیا ہے کسی نے تو کوئی غم نہ کرو
ہر ایک شخص کو اک دن فسانہ ہونا ہے

سنو یہاں سے مرے دوستو اجازت دو
مجھے تلاش میں اپنی روانہ ہونا ہے

رؤف خیر چلو یہ بھی اب غنیمت ہے
بھلائی کہتے ہیں جس کو برا نہ ہونا ہے

رستے میں تو خطرات کی سن گن بھی بہت ہے
منزل پہ پہنچنے کی ہمیں دھن بھی بہت ہے

ہر شہر میں تازہ ہے تو بس زخمِ تعصب
کچھ لذتِ ناخن کا تعاون بھی بہت ہے

کچھ ہاتھوں سے کچھ ہاتھوں کے کالک نہیں جاتی
ہر چند کہ بازار میں صابن بھی بہت ہے

وہ ہاتھ تحفظ کی علامت جسے کہیے
محسوس یہ ہوتا ہے وہی سن بھی بہت ہے

اک جسم کے مانند ہیں ہم لوگ کہیں ہوں
ٹھوکر سے اکھڑتا ہے تو ناخن بھی بہت ہے

ہم شعر کہا کرتے ہیں وجدان کے بل پر
کچھ لوگوں کو زعمِ فعلاتن بھی بہت ہے

بہت دنوں سے کچھ اپنا پتہ نہیں ملتا
کبھی تو چہرہ کبھی آئینہ نہیں ملتا

یہ سچ تو ہے ترے کوچے میں کیا نہیں ملتا
سوال یہ ہے کہ کوچہ ترا نہیں ملتا

وہ آب جو ہوں کہ جس میں ہزار چشمے ہیں
تو تشنہ لب ہے تو کیوں مجھ سے آ نہیں ملتا

کئی دریچے کئی در ہیں اس کی آنکھوں میں
بھٹک گیا ہوں کہاں راستہ نہیں ملتا

کبھی بدلتا ہے منظر کبھی تو پس منظر
کہیں بھی سلسلۂ نقش پا نہیں ملتا

ملے خطوط و رسائل تو کونے کونے سے
بس ایک خط ترا لکھا ہوا نہیں ملتا

وہ شخص خیر سہی غیر ہی نہیں لگتا
ہزار اس سے کوئی سلسلہ نہیں ملتا

نہ ہی مینار نے کلس کا ہے
مسئلہ نفس اور قفس کا ہے

کتنا پیچھے ڈھکیل دیتا ہے
ایک لمحہ جو پیش و پس کا ہے

اس پہ ہرچند نام ہے میرا
یہ بدن ایک ایک نس کا ہے

تیرے ساتھی نکل پڑے کب کے
اور تو منتظر جرس کا ہے

تو اگر کرشن ہے تو تیرے لئے
منتظر ہر مکاں میں مسکا ہے

میں کہاں رام کی تلاش میں ہوں
یہ علاقہ تو راکشس کا ہے

گُل سمجھتا ہے یا اِسے تِتلی
لمس تک فاصلہ جو مس کا ہے

تاش کا گھر نہ تھا گھروندا تھا
دُکھ ہوا کو تہس نہس کا ہے

ہر تماشہ ہمارے بس کا تھا
ہر تماشہ ہمارے بس کا ہے

دیکھ لیکن نہ دیکھنے کی طرح
مشورہ چشمِ بے ہوس کا ہے

ایسی ویسی غزل نہ کہہ کہ ہمیں
ماورائے سخن کا چسکا ہے

خیلہ بھر کیا فریب کھاؤں گا
تجربہ خوب اس برس کا ہے

جانے کیا راز تھا کچھ اس نے بھی پھیکا لکھا
ہائے کھلتا نہیں ہم پر بھی تو جی کا لکھا

ہم کہاں حرف شناس اتنے مگر پڑھتے ہیں
کاغذوں پر ترے ہاتھوں کی نمی کا لکھا

دن کو بازار سے ہو کر بھی گزرنا ہے تجھے
اپنے چہرے سے مٹا تیرہ شبی کا لکھا

ہم نے ویسے تو بہت خود کو بچانا چاہا
ایک اک حرف ہوا خودکشی کا لکھا

سایہ سایہ تجھے ترسے یہ الگ ہے لیکن
ہم نے سورج کو ترے ماتھے کا ٹیکا لکھا

وہ سُنا شہرِ تمنا کی زباں بھول گیا
خیر گزری کہ اسے حال نہ جی کا لکھا

پاسِ جاں اتنا تھا یاروں سے بھی کم کم ہی ملے
ان پہ کھلنے نہ دیا دستِ تہی کا لکھا

ہم اس زمینِ شر پہ بھی ہیں خیر کی طرح
ہم کو نہ بانٹیے حرم و دیر کی طرح

ہم ایک دوسرے کے حوالے سے ہیں یہاں
ہم کو نہ دیکھیے گا کبھی غیر کی طرح

دے کر اذاں بھی دیکھ، جلا کر الاؤ دیکھ
صحرا سے سرسری نہ گزر سیر کی طرح

لوٹے جو تتلیوں کے تعاقب سے تو کھلا
چھالے ہتھیلیوں میں بھی ہیں پیر کی طرح

تیرا خیال پھر ہمیں آباد کر گیا
اک شاخ سبز لاتے ہوئے طیر کی طرح

انسان ہی تو ہیں کوئی اوتار ہم نہیں
دل میں ہماری بات نہ رکھ بیر کی طرح

رستے سے بھید بھاؤ کے پتھر ہٹائیے
کوئی لہولہان نہ ہو خیر کی طرح

المیہ فنا مری ذات پے بہ پے
نظریہ بقا ترے نام ہی تو ہے

ترے رکھ رکھاؤ ہیں کہ مرے سبھاؤ ہیں
غلطی کہاں ہوئی یہی ہو سکا نہ طے

کسی کنجِ عافیت سے نکل کے دیکھئے
جو حریفِ جامِ مئے ہے وہی حریف کے

ہوں نہالِ منکسر، نہیں سیل میں شجر
میں سمے کا دوست ہوں مرا دوست ہے سمے

کہیں جیتنا نہیں، کبھی ہارنا نہیں
یونہی اپنے آپ سے کوئی جنگ تا بکے

مری ہجرتوں کا دکھ نہ سمجھ سکا کوئی
پسِ پردۂ سفر کوئی ہے کوئی تو ہے

میں رؤف خیر ہوں کوئی شئے نہیں ہے شر
نہ پنپ سکا کبھی مرے راستے میں بھے

غیر متداول بحر میں

فروتنی مری دشمن کو معتبر کرتی ہے
بڑے ادب سے وہیں ردِ کبر کرتی ہے

وہ شام جس نے سنبھالے ہوئے رکھا ہے ہمیں
کبھی کبھی تو بہت تیرا ذکر کرتی ہے

یہ رکھ رکھاؤ بھی ملنے سے روکتا ہے ہمیں
یہی انا ہے جو مائل بہ ہجر کرتی ہے

مجھے یہ فکر کہیں شاخِ بے نمو نہ رہوں
یہی زمین بھی کیا میری فکر کرتی ہے

ملال یہ ہے کہ آسودہ ہے وہ چنگاری
جلا کے خاک جو یونان و مصر کرتی ہے

قدم قدم پہ کلیمی رہی جواز طلب
پیمبری کہیں تقلیدِ خضر کرتی ہے

بہ ہر لحاظ سلیقہ ہی شرط ہے ورنہ
غلط مذاقی بھی توہینِ عطر کرتی ہے

نکال سر سے یہ بادِ شمال کا سودا
دکن کی خاک بھی تکریمِ حبر کرتی ہے

رؤف خیر عقیدے کی ضرب ہے ایسی
عدد بڑا بھی اگر ہو تو صفر کرتی ہے

ایک تجرباتی غزل

میں کانچ کا گھر ہوں مجھے پتھر سے بچانا
باہر سے بچانا مجھے اندر سے بچانا

ہونا ہے اسے جذب تو کرنا ہے اسے جذب
دریا کو بھلا کیسے سمندر سے بچانا

رستے میں مسافر کو کہیں نیند نہ آئے
یوں نشۂ اسبابِ میسّر سے بچانا

سر تا بقدم میں تو فقط ایک بھرم ہوں
پڑ جائے جو چھوٹی اسی چادر سے بچانا

آئے نہ کوئی حرف تری کوزہ گری پر
میں ٹوٹ نہ جاؤں کہیں ٹھوکر سے بچانا

سچ پوچھو تو ایک اپنی ہی مٹی میں مزہ ہے
اب ذائقہ کو چیزِ دیگر سے بچانا

تو دوست ہے دشمن کے حوالے مجھے مت کر
میں خجل ہوں یارب مجھے ہر شر سے بچانا

کتابِ جاں کا اُسے صفحۂ غلط لکھنا
اگر نہیں ہیں کہیں اپنے دستخط لکھنا

شکایتیں ہیں تو حرفِ صحیح سے کیا کیا
مزہ تو دیتا تھا تیرا غلط سلط لکھنا

تمام دن ترا چہرہ ورق ورق پڑھنا
وہ رت جگا وہ مرا رات بھر فقط لکھنا

خبر بھی ہے کہ یہ آنکھیں ترس گئیں تجھکو
ہیں کس حساب میں اب اپنے خال و خط لکھنا

صدا ہی سونپ گئی تھی کاسۂ سماعت کو
تجھے جو خیر سے آتا نہیں ہے خط لکھنا

بھلا ہوا ہے خداؤں کا خوش گمانوں سے
وہ کیا ہے ہنس کہ بگلا بھگت کہ بط ـ لکھنا

گرفت میں جو نہ آئے ہنر ہے خیال دہی
جو بات کہنی ہو کر کے خلط ملط لکھنا

ناؤ چھوٹی سی سہی پار سمندر کی ہے
مجھ کو دریا کی یہ آہستہ روی کھلتی ہے

اک یہی بات ترے پاس مجھے لاتی ہے
خوش مذاقی تری خوبی مری کمزوری ہے

اجنبیت ہو تو دہلیز بھی ڈس لیتی ہے
کوئی ساتھی ہو تو ہجرت بھی مزہ دیتی ہے

اس نے بیٹی کو ضرورت کی تو ہر شئے دی ہے
تیل مٹی کا بھی سامان میں ماچس بھی ہے

میری مٹی بھی تری، کوزہ گری بھی تیری
اب حرارت مرے اندر تجھے بھر دینی ہے

اک گزارش ہے کہ دھرتی پہ لکیریں مت کھینچ
حق تو یہ ہے کہ ہماری بھی جنم بھومی ہے

مسئلہ یہ ہے کہ میں چپ بھی نہیں رہ سکتا
اور کہتا ہوں تو خاطر شکنی ہوتی ہے

اور دیتا ہے مزہ آج سلیقہ اپنا
ہائے کیا لذتِ بے راہ روی ہوتی ہے

ہم کو جو بے سر و سایہ نہیں ہونے دیتی
خیر دیوار پرانی ہی سہی گھر کی ہے

کہاں سے پاؤں پساریں کہ گھر میں خاک نہیں
نکل پڑیں تو مزہ بھی سفر میں خاک نہیں

ارے یہ کیا کہ تری رہگذر میں خاک نہیں
تو پھر ہمارے لئے بحر و بر میں خاک نہیں

زمیں کو پاؤں پکڑنے نہیں دیا میں نے
ہنر یہ ہے کہ مرے بال و پر میں خاک نہیں

میں بے نمو نہ رہا سرمہ در گلو نہ رہا
زمینِ شور بھی میری نظر میں خاک نہیں

ہمارا رونا یہی ہے کہ تر نہیں دامن
بڑا غبار ہے دل پر کہ سر میں خاک نہیں

خمیرِ خاک سے کیا کیا نہ شاہکار اٹھے
کمال ہے کہ کفِ کوزہ گر میں خاک نہیں

کہاں کہاں نہ توانائیاں تمام ہوئیں
شرر ہے خاک میں کیا کیا شرر میں خاک نہیں

طبیعت اپنی تھی آمادہ خاک اڑانے پر
مگر کھلا کہ کہیں شہر بھر میں خاک نہیں

ہم اپنے آپ کو منوا نہیں رہے ہیں اگر
تو پھر یہ طے ہے کہ دستِ ہنر میں خاک نہیں

کوئی خدائے سخن کوئی خاتم الشعراء!!
تو خیر کیا مرے حرفِ ہنر میں خاک نہیں

کھل گیا ہم سے بہرحال جو سب سے نہ کھلا
ہائے وہ شخص خدا جانے جو کب سے نہ کھلا

وہ کھلا شہر تھا چیک پوسٹ نہیں تھے جس کے
کوئی دروازہ جہاں نام و نسب سے نہ کھلا

شعرِ مبہم وہ نہ تھا حرفِ مذبذب بھی نہ تھا
جو کسی ڈھب سے کھلا اور کسی ڈھب سے نہ کھلا

میری پہچان ہی کیا تیرے حوالے کے بغیر
میں کسی پر بھی مگر تیرے سبب سے نہ کھلا

کچھ تو ہم نے بھی تکلف سے بہت کام لیا
اور وہ شخص بھی کچھ پاسِ ادب سے نہ کھلا

اسمِ اعظم ہے عجب شاہ کلیدی اپنی
ہم پہ وہ در بھی کھلا جو جد و اب سے نہ کھلا

فرق اک روزنِ دیوار سے کیا کیا نہ پڑا
جو عجم سے نہ ہوا بند عرب سے نہ کھلا

خیل یاروں نے پہاڑوں پہ پہاڑے لکھے
چاہتے کیا ہیں کبھی شعر و ادب سے نہ کھلا

ہمارے نام سے پردہ کہاں اٹھاتی ہے
اسی جگہ تو کہانی بدن چراتی ہے

اِدھر اُدھر کو بھٹکنے کبھی نہیں دیتی
وہ بوئے خوش بدنی راستہ دکھاتی ہے

خطا وہیں سے تو اندھے کے تیر ہوتے ہیں
جہاں سے نیک گمانی فریب کھاتی ہے

یہ ٹوٹنا ہے کہ لُٹنا ہے کہہ نہیں سکتے
خدا گواہ ترا حُسن سومناتی ہے

غلط سلط بھی کبھی فیصلے ہوئے ہم سے
مزاج اپنا ذرا غیر تجزیاتی ہے

کسی طرح سے سہی دن گزر ہی جاتا ہے
مگر وہ رات کہ جب نیند ٹوٹ جاتی ہے

انا کے ہاتھ میں تلوار ہے جو دو دھاری
کبھی کبھی تو خود اپنا لہو بہاتی ہے

کوئی کتاب ہو بین السطور ہی پڑھیئے
یہ راکھ وہ ہے جہاں آگ منہ چھپاتی ہے

کسی طرح تو کرائے کی علتوں سے بچے
نواحِ شہر میں اک گھر تو خیر ذاتی ہے

ترا خیال ہی دل سے نکل گیا جیسے
ہمارے شعر کا مصرع بدل گیا جیسے

سفر میں اس کا کلیجہ دہل گیا جیسے
بھنور سے بچ کے وہ پہلے پہل گیا جیسے

یہ کس کا روشنی دیتا ہوا سا پیکر ہے
چراغ سا کوئی رستے میں جل گیا جیسے

سفید گھوڑے کی زد میں ہیں بادشاہ و وزیر
اڑھائی گھر کی کوئی چال چل گیا جیسے

سنا ہے جب سے کہ کائی بھری زمین ہے تو
بڑے بڑوں کا بھی پاؤں پھسل گیا جیسے

نئی کہانی نئی رات پھر نیا لہجہ
خلاف قصہ ضرب المثل گیا جیسے

زبان پھیر رہا تھا وہ خشک ہونٹوں پر
ہمارا حرف تر و تازہ کھل گیا جیسے

تشنہ رہیں گے اپنے بگڑنے کے مرحلے
آئے جو ہیں نگاہ میں پڑنے کے مرحلے

میرے لئے زماں و مکاں پھیلنے لگے
طے ہو رہے ہیں تجھ سے بچھڑنے کے مرحلے

یہ چھالا چھالا پاؤں یہ ہاتھوں کی سختیاں
یاد آئے تتلیوں کے پکڑنے کے مرحلے

آنکھوں میں ریت بھر گئی ہمدرد تھی ہوا
نادیدنی تھے خیمے اکھڑنے کے مرحلے

پھر جیسے پتھروں کے حوالے ہوتے ہیں ہم
نازک تھے آئینے سے بچھڑنے کے مرحلے

خود کو سنبھالنا بھی قیامت ہے ان دنوں
اب ہم ہیں اور آگ پکڑنے کے مرحلے

خوش تھے رؤف خیرؔ جو دنیا سے لڑ چکے
باقی ہیں اپنے آپ سے لڑنے کے مرحلے

یہ سچ ہے رہنے کو رہتا ہے اب بھی تو مجھ میں
کوئی پرندہ ہے جیسے لہو لہو ——— مجھ میں

یہ ریگ زار پنپنے مجھے کہاں دیتا
ابل پڑی وہ جو تھی قوتِ نمو مجھ میں

ہو کوئی مسئلہ مجھ کو تو اب لگتا ہے
کہ دو حریف ہیں مصروفِ گفتگو مجھ میں

ہوا بس اتنا کہ آنکھوں میں جم گئی آکر
نہ رہ سکی مرے اندر کی ہاؤ ہو مجھ میں

نہ آگ ہے نہ دھواں ابر ہے نہ ریگِ رواں
بھٹک رہا ہے اک آسیبِ آرزو مجھ میں

وہ تجربے ہیں کہ جی مصلحت پسند نہیں
رہی نہ اب وہ مروّت جو تھی کبھو مجھ میں

عائد کسی طرح کی بھی تحدید مت کرو
کیا دوست ۔ دشمنوں پہ بھی تنقید مت کرو

بیعت کرو تو ایک ہی دستِ رسول پر
دو رکعتی امام کی تقلید مت کرو

کھینچو بڑی لکیر ۔ لکیروں کے درمیان
چھوٹی کسی لکیر کی تردید مت کرو

بے رس جنھیں ہوائے زمانہ نے کر دیا
اب اُن تلوں سے تیل کی امید مت کرو

جگنو ہے ہاتھ میں ید بیضا نہیں کوئی !
اندھیر ہے اہانتِ خورشید مت کرو

جب دھوپ پی چکے ہو تو پھر دودھ بھی پیو
کس نے کہا کہ خیر سے تم عید مت کرو

دریا میں ایک چشمۂ زہراب ہے مگر
یہ تشنہ لب تو خوگرِ شہداب ہے مگر

وہ حرفِ جاں گداز جہاں تاب ہے مگر
اک آئینہ کہ زینتِ محراب ہے مگر

ثابت ہوا کہ اپنے خد و خال ٹھیک ہیں
مانا وہ آئینہ سہی بے آب ہے مگر

اس سے جو ہے وہ سطحِ ملاقات اور ہے
وہ بھی شریکِ حلقۂ احباب ہے مگر

کہنا ہے یہ وہ چہرہ کتابی اگر ملے
تیرا جواب آیتِ نایاب ہے مگر

صحرا ہے بے کلیم نہ گلزار بے خلیل
کیا کیا گمانِ شعلۂ شاداب ہے مگر

یہ اور بات ہے وہ خرابِ خمارِ خواب
میراثِ خیر دیدۂ بے خواب ہے مگر

ہم نے کب حرفِ پس و پیش کا احسان لیا
مان لینا جسے چاہا ہے اُسے مان لیا

آنکھ جھپکی تھی کہ سورج تھا سوا نیزے پر
خواب دیکھا کہ مسافت نے بُرا مان لیا

صاحبو! منزلِ نازک سے گزرنا دیکھو
ہاتھ دامن سے اٹھایا تو گریبان لیا

کہہ دیا تیرے جھجکنے [illegible] ے ایا کیا
حرفِ ناگفتہ سے [illegible] ے تجھے پہچان لیا

شباہتیں تو بہت کچھ ہیں بھائی بہنوں میں
بلا کا فرق بڑے فاصلے ہیں ذہنوں میں

گھرا ہوا ہے وہ خوش پوش کن برہنوں میں
دریدہ پیرہنوں میں دریدہ دہنوں میں

یہ پھول تشنگیِ گلدان کا شکار ہوئے
کریں بھی کیا کہیں مٹی نہیں ہے صحنوں میں

ہے سونا سونا حقیقت میں پور پور اس کا
سمجھ رہا ہے یہی وہ مگن ہے گہنوں میں

مجھے لپیٹ لیا اس نے اپنی چادر میں
مرا شمار کہاں رہ گیا برہنوں میں

وہ آب جو تھی سمندر سے ہمکنار ہوئی
زمیں پکار رہی تھی اداس لحنوں میں

یہ قافیے ہیں غزل کے! یہ حرکتیں کیا ہیں!!؟
یہ چاند اور یہ سورج ہیں خیر گہنوں میں

اب وہ دلّی ہے نہ لاہور چناجور گرم
خاک اڑتی ہے ہر اک اور چناجور گرم

جنگلوں میں بھی تو بارود بچھی رہتی ہے
رقص کرتے نہیں اب مور چناجور گرم

خون میں جس کو نہانے کا ہنر آتا تھا
ہے پسینے میں شرابور چناجور گرم

پھر سرفراز ہوئے آکے لنکالے ہوئے بت
پھر اٹھا شور چناجور چناجور گرم

رات کی کوکھ سے سورج کو جنم لینا تھا
ہم نے دیکھی ہی نہیں بھور چناجور گرم

عزتیں شہر میں نیلام ہوئی جاتی ہیں
عشق بے چارہ ہے کمزور چناجور گرم

ہے سرِ ظلِ الٰہی پہ گدھوں کا سایہ
ہو گئے ڈھیر سبھی ڈھور چناجور گرم

دم لیا تھا نہ ابھی میر کے گھر والوں نے
پھر گھٹا چھائی ہے گھنگھور چناجور گرم

اک لٹکتی ہوئی تلوار کے نیچے سر ہے
ٹوٹ جائے نہ کہیں ڈور چناجور گرم

ہجرتیں راس بھلا سب کو کہاں آتی ہیں
وہ بھی ہیں زندہ و در گور چناجور گرم

خیر صاحب یہ ترا جوش بُرا ہو تلے
آپ بھی ہو گئے منہ زور چناجور گرم



یہ آسمان تو کچھ بھی نہیں ہے میرے لئے
لہو کا زور میرے بال و پر میں اتنا ہے

بے اعتنائی آنکھ سے نادیدہ دیکھنا
پُرکھوں کی جائیداد کو بوسیدہ دیکھنا

دیدہ دلیری سرِ بے دیدہ دیکھنا
بے آب آئنے میں ہے غلطیدہ دیکھنا

پانی پہ خدوخال کے سب جھول کھل گئے
کیا کیا ہے اپنے آپ سے پوشیدہ دیکھنا

پردہ عذاب ہے پسِ پردہ عذاب ہے
مشکل ہے ماورائے دل و دیدہ دیکھنا

بے آشیے گیاہ علاقے میں آ گئے
کیا دن دکھا گیا سرِ شوریدہ دیکھنا

اک لذتِ تمام ہے آنکھوں کے واسطے
بے خواب دیکھنا مجھے خوابیدہ دیکھنا

ہم نے سب اپنا درد ہنسی میں اڑا دیا
اچھا نہیں لگا اسے رنجیدہ دیکھنا

پڑتی ہے جب بھی شوخ مناظر پہ یہ نظر
آتا ہے یاد وہ ترا دزدیدہ دیکھنا

تو تو ہے شوخ طبع بلا کا رؤف خیر
خود اک مذاق ہے تجھے سنجیدہ دیکھنا

اٹھے ہیں تیل کی ترائی سے
دوستی کو دیا سلائی سے

کیسا پربت بنا ہے رائی سے
لیجئے پھر ٹھن گئی ہے بھائی سے

خوش گمانی سے ہم نے کام لیا
اس نے دھوکا دیا صفائی سے

ہم مہاجر نہ تم کوئی انصار
بات کرلو ذرا بھلائی سے

خیر اپنی منا رہا ہے غیر
میں جو الجھا ہوا ہوں بھائی سے

بے وفا خیر ہم کبھی تھے لیکن
دکھ ہوا اس کی بے وفائی سے

اس سیلِ بے اماں کا بہاؤ بھی مان لو
پھر مجھ کو ایک نوح کی ناؤ بھی مان لو

یہ جوبِ آتشیں یہ دھوئیں کی گواہیاں
جنگل میں قافلے کا پڑاؤ بھی مان لو

تاپے اگر ہیں ہاتھ تو دل بھی اُجالتے
جب آگ مان لی ہے الاؤ بھی مان لو

خالی مکان دیکھ کے آسیب گھس نہ جائیں
پردیسیو! پلٹ کے اب آؤ بھی مان لو

یہ اور بات ہے کہ اسے ہم نے طے کیا
آیا تھا راستے میں چڑھاؤ بھی مان لو

ہر بات کا ثبوت نہ مانگا کرو یہاں
کچھ بے نشان ہوتے ہیں گھاؤ بھی مان لو

وہ تو کھلی کتاب ہے اے کافرانِ خیر
ایمان اک رسول پہ لاؤ بھی مان لو

ہزار تہنیتیں بھی ملیں گلے بھی ہوئے
مری کتاب پہ دیمک کے تبصرے بھی ہوئے

خمارِ خواب کے بے خواب تجربے بھی ہوئے
وہ دن بھی کیا تھے ترے نام رتجگے بھی ہوئے

تمام جھوٹی انا تھی یہی تو اک سچ ہے
ہمیں تو ہونا تھا رسوا ترے لیے بھی ہوئے

زمیں سے ربط مگر ٹوٹ ہی نہیں پاتا
دراز اپنی اڑانوں کے سلسلے بھی ہوئے

ہزار قرب کے پہلو تھے درمیان مگر
پہاڑ جیسی روایت کے فاصلے بھی ہوئے

رکے تو بادِ صبا سے بھی خوف آتا تھا
چلے تو خیر ہواؤں کے سامنے بھی ہوئے

ہیں خالِ رخ ہوا حق ہیں ترے چشمِ بد کے ساتھ
یہ صفر بھی شمار میں رکھنا عدد کے ساتھ

قرأت میں اک جلال کتابت میں اک جمال
تو حرفِ خوش نوا ہے مزہ دے جو مد کے ساتھ

شریان اور ورید کی سمتیں جدا سہی
ہے اک دلی لگاؤ ازل کا ابد کے ساتھ

ہے ایک کھیل آمد و رفتِ خمارِ گل
سودا یہ پٹ گیا تو ہے دل کا خرد کے ساتھ

مخطوطۂ بدن ہو کہ مکتوبِ دل — نظر
پڑتی ہے کس خلوص سے کس شد و مد کے ساتھ

ناخن پہ کوئی بار نہ ٹھہری کبھی گرہ
دستِ ہنر نبھاتا رہا نیک و بد کے ساتھ

وہ حرفِ ماورائے سخن جانتا نہیں
مشکل ہی ہے ذائقہ نابلد کے ساتھ

مسجد نہ خانقاہ کہ ہم سے خراب حال
اٹھیں ادب کے ساتھ جو بیٹھیں تو حد کے ساتھ

تم خیر جو بھی ہو مری پہچان بھی تو ہو
میں تو بجائے خود ہوں سبب بھی وتد کے ساتھ

دہلیز پر کھڑا ہے لہو رنگ آفتاب
کب تک رہو گے یونہی خرابِ خمارِ خواب

حائل کبھی حجاب تو حارج کبھی نقاب
وہ کھل نہیں سکے کہ ہے دنیا بڑی خراب

ہے کس کو ہوش کونسا پل کٹ گیا کہاں
اب عمرِ رائیگاں کا نہ مانگا کرو حساب

یہ ضد ہوا کو ہے میرا خیمہ اکھاڑے گی
یہ ضد زمیں کو مری مٹی نہ ہو خراب

چڑیا درخت پر تو نہیں دسترس میں ہو
بہتر ہے ہاؤ ہو سے تو اک حرفِ دستیاب

حرفِ نجات و توبہ سے مشرق کو عار ہے
مغرب سے اور کیا نکل آئے گا آفتاب

اس شہرِ شور میں ہے غنیمت رُوئے خیر
ایک یارِ خوش سخن تو کم از کم ہے دستیاب

چھاؤں میں بیٹھے ہوئے جَل سے زیادہ
مسئلے گھر میں ہیں کابل سے زیادہ

بوئے گل ٹھہری کہاں گل سے زیادہ
ہم نے جانا ہے تجاہل سے زیادہ

یہ حقیقت ہے تخیل سے زیادہ
حسن پتھر میں بھی ہے گل سے زیادہ

ایک حرفِ نارسا اور کچھ نہیں ہے
بیچ میں ٹوٹے ہوئے پل سے زیادہ

راستہ سب کچھ نہیں منزل بھی تو ہے
جزو میں لذت نہ لے کُل سے زیادہ

اب کھلا ہم پر نہیں ہے مول اپنا
اک ترے حرفِ تامل سے زیادہ

کب ہیں سرگرداں بدن کے واسطے ہم
مل ہی جاتا ہے توکل سے زیادہ

اہمیت ہے نجیبؔ انداز نظر کی
شعر میں رنگ تغزل سے زیادہ

شہر میں اتنے پیدا ہم اپنی کس خوبی سے ہوئے
قابلِ رشک و خوش قامت تیری محبوبی سے ہوئے

یوں تو مسائل سب اپنے طے خوش اسلوبی سے ہوئے
باقی جتنے فتنے تھے سید سے سرکوبی سے ہوئے

پیرہنِ یوسف نے کیا راز تمہارا فاش تمام
تم وہ بھائی کہ شرمندہ دیدۂ یعقوب سے ہوئے

خیر یہی نا آخر مقتول ہی اپنے قاتل تھے
دھبے دامن و خنجر سے نمایاں کس خوبی سے ہوئے

غریبِ شہر سے اتنے تپاک سے نہ ملو
جو تم ہوا کا ہو جھونکا تو خاک سے نہ ملو

"ہنر ہزار کفِ کوزہ گر سے کھلتے ہیں"
یہ کیا کہ خاک ہی ٹھیرے تو چاک سے نہ ملو

ہزار آنکھیں ہیں جیسے لگی ہوئی ہم پر
نظر لگے نہ کہیں انہماک سے نہ ملو

نہ دشتوں کی خبر ہو نہ دامنوں کی تمہیں
اگر ہمارے گریباں کے چاک سے نہ ملو

بری کچھ اتنی بھی آلودگی نہیں ہوتی
گمانِ پاک لئے مشتِ خاک سے نہ ملو

بچھڑنے والو جدائی کا حوصلہ ہے ہمیں
خبر کی طرح کسی روز ڈاک سے نہ ملو

پتہ نہیں تمہیں کس بات پر ہے ناز اتنا
ہیں کج کلاہ بڑے ہم بھی ناک سے نہ ملو

فسادِ ذہن و لبِ زہر آشنا لے کر
رؤف خیر کے شہدابِ تاک سے نہ ملو

کیسا میلے گھر میں ذرا شور دیکھنا
فرصت سے پھر کراچی و لاہور دیکھنا

دنیا نہیں ہے زیب کسی اور دیکھنا
جہدِ مسلسل مگس و مور دیکھنا

پہلے خود اپنی آنکھ کا تنکا تو دور کر
پھر دستِ خوش حنا میں کوئی چور دیکھنا

آخر یہ کیسی خاک سی اڑتی ہے چار سو
بادِ شمال کیوں ہوئی منہ زور دیکھنا

دیوار ڈھائے گی کہ کوئی فصل لائے گی
ہر سو گھٹا تو چھائی ہے گھنگھور دیکھنا

اپنے پیروں میں مست ہے پیروں کو بھول کر
رقصاں ہے کس مزے سے ابھی مور دیکھنا

دیکھو نہ یوں بھنووں میں گرہ ڈال کے مجھے
ٹوٹے نہ درمیاں سے کہیں ڈور دیکھنا

میرے مذاقِ حسن میں شامل ہے عشق بھی
ہر طرح سوچ لو تو مری اور رہ دیکھنا

یارانِ بدگماں کو یہ حسرت ہی رہ گئی
مجھ کو اسیرِ لمحۂ کمزور دیکھنا

ہم جانتے ہیں خیر یہ سب کس کی آنکھ ہے
یہ اور دیکھنا نہ ترا چھور دیکھنا



میں زندگی کا ایک دہکتا الاؤ ہوں
گر ڈیادہ موم کی مرے پاس آنے سے رہی

پھولوں کی بیل ہے کہ بھرم کی نقاب ہے
بیرونِ بام و در ابھی گھاس آنے سے رہی

بڑے بڑوں نے لکھا ہے ہی قصیدہ تو
اٹھاؤ آنکھ پڑھو حسن کا صحیفہ تو

عجیب میٹھی کسک ہے رویئں رویئں میں رواں
متاعِ جاں ہے دھڑکتا ہوا کلیجہ تو

لبِ نشاط سے پھوٹا ہے زمزم شہد آب
حصارِ جسم سے باہر نہیں ہے کعبہ تو

نہ پھول آئینہ دار بدن نہ رنگِ شفق
حضورِ حسن ہے پھیکا ہر استعارہ تو

یہ تھرتھراتے ہوئے لب یہ سر سراتا بدن
تمہارے نام معنون ہیں من و سلویٰ تو

یہ کھلکھلاتا ہوا چہرہ، بولتی آنکھیں
وہ خود کو یاد نہ رکھے تمہیں جو دیکھا تو

نشہ سا آتا ہے اک تم کو دیکھ لینے سے
نشاطِ حرف و صدا تم سے بات کرنا تو

یونہی نہیں ہوئے کچھ ہم تمہارے گرویدہ
خرید لیتا ہے ہم کو تمہارا لہجہ تو

یہ واقعہ ہے ستارے سے تم نہیں منسوب
تمہارے نام سے منسوب ہے ستارہ تو

چلے ہی آتے ہیں تشنہ دہان خوش نظری
تمہاری ذات میں سمٹا ہوا ہے دریا تو

ہجومِ جلوہ سے خلوت میں ٹوٹتا ہے بدن
نیا ہے ذوقِ نظارا ذرا سنبھلنا تو

وصالِ یار سے بڑھ کر نہیں کوئی ساعت
رؤف خیر نے فی الحال اتنا جانا تو

دامن نہ پساریں یہ ارادہ بھی رہا ہے
کیا لینا جو وہ ہاتھ کشادہ بھی رہا ہے

اندازۂ ظرفِ صفِ اعدا بھی رہا ہے
شب خون کا امکان زیادہ بھی رہا ہے

ہیں مارے ہوئے ہم تو تری خوش بدنی کے
ناکام ہی کچھ تیرِ لبادہ بھی رہا ہے

لکھ لکھ کے کئی نام مٹانے بھی پڑے ہیں
یہ دل کہ بہت صفحۂ سادہ بھی رہا ہے

ہر فلسفۂ عہد ہوا حرفِ مکرر
اس طرح ترا ذکر زیادہ بھی رہا ہے

کس شخص کے ہاتھوں میں تھماتے ہو پیالہ
دیکھو تو وہ شائستۂ بادہ بھی رہا ہے

دراصل کبھی مات نہ کھانے کا ہنر سیکھ
فرزیں کے مقابل تو پیادہ بھی رہا ہے

کس کوچۂ سربستہ میں حیراں ہو نہ بھولو
اک شخص سے لوٹ آنے کا وعدہ بھی رہا ہے

ہم خیر اسی ضد میں تو آگے نکل آئے
سنتے تھے کہ مشکل ترا جادہ بھی رہا ہے

نہ میں عرب ہوں نہ دنیا عجم ہے میرے لئے
مری خموشی ہی گویا بھرم ہے میرے لئے

نمو کا جوش سلامت ہیں بے نشان نہیں
کمال یہ ہے کہ ہر خاک نم ہے میرے لئے

کوئی خمار ہو یا بت ہو ٹوٹ جاتا ہے
عجیب مرحلۂ کیف و کم ہے میرے لئے

یہی نظر تو کہیں ٹھیرنے نہیں دیتی
ترے لئے جو خدا ہے صنم ہے میرے لئے

نہ اپنی فکر رہی مجھ کو رہی نہ دنیا کی
ترا خیال بڑا خوش قدم ہے میرے لئے

اسے قریب سے دیکھوں تو جانے کیا نکلے
وہ شخص خیال ابھی محترم ہے میرے لئے

وہ وحشی ہم ہیں کہ یوں بھی کسی کے بس کے نہیں
شروع ہی سے جو عادی کسی قفس کے نہیں

حرارتوں کا بھی اندازہ کر جھلس کے نہیں
کہ زندگی کے تقاضے کوئی ہوس کے نہیں

سہا ہے کیا کیا نہ اب تک بھی ہم نے ہنس کے نہیں
تمہیں کہو کہ یہ حالات کس برس کے نہیں

اسی خیال سے پھر آنکھ لگ گئی شاید
ہمارا نام لبوں پر ابھی جرس کے نہیں

ہمیں نے کچھ نظر اندازیوں کی حد کر دی
بُرا نہ مان کہ یہ گھاؤ تیرے بس کے نہیں

حیات جبر سے اے دوست موت بہتر ہے
گزار زندگی لیکن ترس ترس کے نہیں

نکل پڑے ہیں ہوا میں چراغِ جاں لے کر
ہم ابتدا ہی سے انسان پیش و پس کے نہیں

ہمیں سے کس لئے چنگاریاں اُلجھتی ہیں
ہم آدمی ہیں مگر خیر خار و خس کے نہیں

مقفل سجے ہیں کوچہ و بازار کی طرح
ہر شہر میں فساد ہے تہوار کی طرح

پوجے نہ جاؤ گے کسی اوتار کی طرح
بہتر یہی ہے جی لو گنہگار کی طرح

ہے بادِ تند سر کو پٹک کر لہو لہان
جانِ حزیں ہے راہ میں دیوار کی طرح

یہ سوچتا کھڑا ہوں سرِ راہِ پیش و پس
کیسے نباہوں تم سے ریاکار کی طرح

چہرہ بدل بدل کے جو آتا ہے سامنے
ہر شخص جی رہا ہے اداکار کی طرح

میں ہوں ازل سے راہروِ راہِ منحنی
رستے میں پل صراط ہے تلوار کی طرح

کسی کے سنگِ ملامت سے اور حسد سے بچاؤ
مجھے جنوں سے بچاؤ مجھے خرد سے بچاؤ

میں ابر ہوں مجھے یوں بھی کہیں برسنا ہے
مگر خدا کے لیے دشتِ نابلد سے بچاؤ

میں بے لباس ہوں اب آ کے شکستہ دیوارو
مجھے ملامتِ شہرِ دراز قد سے بچاؤ

میں اک جزیرہ ہوں تم ماہتاب کامل ہو
گھرا ہوا ہوں سمندر کے جزر و مد سے بچاؤ

یہاں تو جو بھی ہے بھٹکا ہوا ہی لگتا ہے
کہوں میں کس سے مجھے راہِ مستند سے بچاؤ

مراد جو مرے دور کا تقاضہ ہے
مجھے خدا کے لئے قاتلوں کی زد سے بچاؤ

کہا کرد نہ لہو صرف کر کے خیرِ غزل!
خدا کے واسطے خود کو نگاہِ بد سے بچاؤ

آپ اپنے سے دوستی قبلہ بند آگے ہے یہ گلی قبلہ

خام پرواز و رنگِ خام کا نام ایک تتلی بچی کھچی قبلہ

کب کبوتر کو راس آتی ہے اِن عقابوں کی دوستی قبلہ

میرے اندر بھی بھیڑیا ہے کوئی ہے اگر تم میں لومڑی قبلہ

دھیرے دھیرے مگر بیا کی طرح گھر بناتی ہے بدظنی قبلہ

آخرش دھوپ سو گئی تھک کر شام تک ساتھ ساتھ تھی قبلہ

زندگی دلفریب گڑیا ہے وہ بھی بارود کی بنی قبلہ

راکھ میں ڈھونڈتی ہے چنگاری کیا غضب ہے یہ آس بھی قبلہ

اپنے ہونے کا کچھ یقیں آئے خط تو لکھیے کبھی کبھی قبلہ

کوچۂ فن میں ہو نہیں سکتا کوئی فنکار آخری قبلہ

خیبرؔ درسِ عروض دیتے ہیں کر کے بے بحر شاعری قبلہ

اُڑتے تھے آسماں میں کبوتر یہاں وہاں
بے پر پڑے ہیں اب وہ زمیں پر یہاں وہاں

موسم بڑا سہانا ہے باہر یہاں وہاں
کیسی شکست و ریخت ہے اندر یہاں وہاں

کوئی اثر رُتوں کا بدن پر نہیں رہا
کیا دیکھتے ہوا اسے چھو کر یہاں وہاں

دستِ ہوا میں آ نہ سکا دامنِ چراغ
دیکھا ہزار بار اُلجھ کر یہاں وہاں

سورج بتر بدوقت کی صورت نکل پڑا
بکھرے پڑے ہیں خواب بہتّر یہاں وہاں

یوں ہی راز و نیازِ نامعلوم — کب تک اے دلنوازِ نامعلوم

یوں کبوتر کھلے نہ چھوڑ اپنے — اِن پہ جھپٹے گا بازِ نامعلوم

فیصلے ڈھل گئے فسانوں میں — تب کھلا ساز بازِ نامعلوم

خاکساروں سے بھی ملا کیجئے — جائیے تا فرازِ نامعلوم

آنکھ میں بال پڑ گیا جیسے — ساتھ ہے حرص و آزِ نامعلوم

میں بڑا سخت جان ہوں، تیرا — درد ہے یا گدازِ نامعلوم

بدگمانی بڑی بری شے ہے — کھولتی ہے محاذِ نامعلوم [۱]

کون جانے اسے کہاں چھوڑا — لے اڑا تھا جہازِ نامعلوم

ٹوٹنے پھوٹنے نہیں دیتا — جذبۂ ارتکازِ نامعلوم

میرے بارے میں گھڑ گیا کیا کیا — اک فسانہ طرازِ نامعلوم

خیر گرنے ہمیں نہیں دیتا — ایک دستِ درازِ نامعلوم

[۱] صوتی قافیہ

لُٹنے کا شوق کب تھا جو سج دھج کے شہر میں
لوگ آ گئے تھے گاؤں سے سب بچ کے شہر میں

انہونی تھی جو ہو کے رہی دکھ یہی تو ہے
کیا سائرن تھے رہ گئے بج بج کے شہر میں

لوٹے خود اپنے سایوں سے خوش ہم سے ہیں خفا
اندھیر کس قدر ہے یہ سورج کے شہر میں

اس جنگ میں تو دستِ اماں بھی شریک ہے
اک بے کلی کا راج ہے دھیرج کے شہر میں

مہنگا پڑے گا میرا لہو سوچ لیجئے
میں سخت جاں ہوں قتلِ مروّج کے شہر میں

پائے ثبات ہوں میں ہر اک پل صراط پر
دستِ دراز ہوں کلمہ کج کے شہر میں

انصاف کی جو پوچھو تو کہہ دوں خطا معاف
احساسِ مجرمانہ ہے ہر جج کے شہر میں

ہمراہ جبرئیل و ابابیل بھی نہیں
بھیجا گیا ہوں اوس کے خزرج کے شہر میں

میں خطِ خاتر اسود و ابیض کے درمیاں
حرفِ صحیح ۔ لہجہ کج کے شہر میں

کہ سحرِ سامری وقت چل نہ پائے گا
یہ سانپ میرے عصا کو نگل نہ پائے گا
جو حرف حرف کھلونوں میں ڈھل نہ پائے گا
کسی کتاب سے بچہ بہل نہ پائے گا
وہ میرا دوست سہی جھول جھول ہے آخر
اُسے سنبھالنے والا سنبھل نہ پائے گا
مرا چراغ تو آندھی میں بھی سلامت ہے
انھیں گمان ہی تھا کر چل نہ پائے گا
چلا ہے لے کے کہاں یہ شرار تو بھی
کہ برف زار میں یہ بیج پھل نہ پائے گا
انا کے ریشمی تاروں سمیت اُبال اُسے
وہ اپنے خول سے باہر نکل نہ پائے گا
ہمیں تلاش کتابوں میں اور سینوں میں
مشاعروں میں ہماری غزل نہ پائے گا
زمانے بدلیں گے موسم بھی فلسفے بھی مگر
یہ حرفِ خیر کا سکہ بدل نہ پائے گا

کیسی ہوا بدل کے اچانک ہی رہ گئی
سر کھو گیا کلاہ مبارک ہی رہ گئی

مانگی جو آفتاب سے پہچان کی دلیل
محراب ہر چراغ میں کالک ہی رہ گئی

کیا کیا سکون لذت لاعلمیت سے تھا
خود آگہی کہ جان کی گاہک ہی رہ گئی

تھا شانت بھی اشانت بھی ساگر سا وہ بدن
یادش بخیر سینے میں ٹھنڈک ہی رہ گئی

ٹھہرا ہر ایک جرعۂ زہراب رائیگاں
بے انت پیاس تو مرا مسلک ہی رہ گئی

بین السطور تم نے پڑھا بھی نہیں مجھے
تم سے جو بات کہنی تھی گنجلک ہی رہ گئی

شاید اب اس مکان میں رہتا نہیں کوئی
پاگل بنی ہوئی مری دستک ہی رہ گئی

گل وہ ہنر چراغ سحر دم تو ہو گیا
تحسین ناشناس کی کالک ہی رہ گئی

تھے سو چراغ ایک سیاہی کی بوند میں
ممنوع ہو کے خیر وہ پستک ہی رہ گئی

اگر یہ سچ ہے کہ سچائیاں نہیں بکتیں
مری دوکان پہ بیساکھیاں نہیں بکتیں

گھروں سے کٹ گئے کچھ بھائی راستوں میں کٹے
سو اہتمام سے اب راکھیاں نہیں بکتیں

سروں کو مفت ہی ملتی ہیں گولیاں کیا کیا
سڑک پہ دیکھو تو ترکاریاں نہیں بکتیں

حروف سیکھ کہ ہر در پہ قفل ابجد ہے
رہے خیال کہیں چابیاں نہیں بکتیں

یہ منتظر ہیں کنویں پر کلیم ہی کیلئے
خطا معاف کبھی لڑکیاں نہیں بکتیں

خرید لیتے ہیں دنیا خریدنے والے
یہ تم سے کس نے کہا وردیاں نہیں بکتیں

وہ ہو جہنم کہ ہو جنّتِ آدم
بدستِ حور کہیں، مگر یہاں نہیں بکتیں

یہاں تو ہاتھ قلم کر دیئے گئے ہیں کئی
سو اس نگر میں کہیں تختیاں نہیں بکتیں

یہاں وفا تو ملی اور دوستوں سے ملا
کہیں خوشی یا کبھی گالیاں نہیں بکتیں



بس تجھے دیکھتے رہنے کی قسم کھائی ہے
اور کیا اس کے سوا مصرفِ بینائی ہے

وہ مرا حقِ سکونت نہیں دیتا مجھ کو
اور اس پر بھی یہ دعویٰ ہے مرا بھائی ہے

آسماں کے نہ ہوئے اور زمیں کے نہ رہے
آج ہم تجھ سے بچھڑ کر تو کہیں کے نہ رہے

کون کہتا ہے کہ اصحابِ یمیں کے نہ رہے
ہم وہ حُر ہیں جو کبھی شمرِ لعیں کے نہ رہے

آسمانوں کی بلندی پہ نظر ہے اس کی
اب وہ انداز ترے خاک نشیں کے نہ رہے

لوگ کیا سادہ ہیں ہر بُت کو خدا کہتے ہیں
یہ تقاضے ہی کبھی اپنی جبیں کے نہ رہے

نام لکھتے ہیں فقط پرکھوں کی دیوارِ دل پر
خوش گماں ہیں وہ کچھ اتنے کہ یقیں کے نہ رہے

خیر وہ چہرے نقابیں ہیں انا کی جن پر
آئینے کے نہ رہے آئینہ بیں کے نہ رہے

جو ہو جہاز بھی زد میں تو ڈھیر ہوتا ہے
فضا میں ایک پرندہ بھی شیر ہوتا ہے

اُدھر ہے مہر اِدھر تابکار اک ذرّہ
جسے زوال نہیں تھا وہ زیر ہوتا ہے

ہمارے دل میں اترتی نہیں دماغ کی بات
کہ یار اس میں بڑا ہیر پھیر ہوتا ہے

تمام دشت و جبل ریت کے گھروندے ہیں
تمہارا چاہنے والا دلیر ہوتا ہے

اب آزما بھی تماشے سے آخری اپنے
یہ سیر چشم کہاں ایسے سیر ہوتا ہے

خطا معاف کہ مشکل ہی ہے تخیر کے ساتھ
یہ سرفراز ہی اکثر بدیر ہوتا ہے

سجی نہ انجمن خود ستائیاں اب کے
کتاب کی نہ ہوئیں رونمائیاں اب کے

پہنچ گئی ہیں وہاں نارسائیاں اب کے
یہ ڈر ہے پاٹ سکیں گے نہ کھائیاں اب کے

جگہ جگہ تو ہوئیں وہ لڑائیاں اب کے
دہائی دیتی ہیں سونی کلائیاں اب کے

سفید آنکھ میں سارے سیاہ منظر ہیں
غائب ہو گئیں کیا کیا ترائیاں اب کے

نظر پہ کھل گئیں عریانیاں تمام اس کی
بچا سکیں نہ اسے خوش نمائیاں اب کے

ہماری خاک سے نکلیں نشانیاں کیا کیا
کہ رائیگاں نہ گئیں کچھ کھدائیاں اب کے

یہ فاصلے کوئی دشوار اسقدر تو نہ تھے
پہاڑ بن گئیں بے نام رائیاں اب کے

نہ جانے کس کی دعا کام آ گئی ورنہ
ہماری جان ہی لیتیں دوائیاں اب کے

وہ ہم سے خاک نشینوں کا ہم نشیں نکلا
تو سرفراز ہوئی ہیں چٹائیاں اب کے

ہمارا بھائی بھی سمجھا نہیں ہمیں بھائی
سو دل دکھا تو دکھا انتہائیاں اب کے

کچل گیا ہے سر راہ نوجوان کوئی
کہ لٹ گئی ہیں کسی کی کمائیاں اب کے

رؤف خیر نے چپ سادھ لی ہے یہ کیسی
کہ کھل رہی ہیں بہت بے نوائیاں اب کے

بکتی نہیں فقیر کی جھولی ہی کیوں نہ ہو
چاہے رئیسِ شہر کی بولی ہی کیوں نہ ہو
احسانِ رنگِ غیر اٹھاتے نہیں کبھی
اپنے لہو سے کھیل وہ ہولی ہی کیوں نہ ہو
سچ تو یہ ہے کہ ہاتھ نہ آنا کمال ہے
دنیا سے کھیل آنکھ مچولی ہی کیوں نہ ہو
ہے آسماں وسیع، زمیں تنگ ہی سہی
تعمیر کر کہیں کوئی کھولی ہی کیوں نہ ہو
حق پر جو ہے وہی سرو شانہ بلند ہے
ہے ورنہ بے بساط وہ ٹولی ہی کیوں نہ ہو
دریا کی کیا بساط کہ مجھ کو ڈبو سکے
کشتی کہیں کہیں مری ڈولی ہی کیوں نہ ہو
تلخی میں بھی مزہ ہے جو تو خوش مذاق ہے
پک جائے تو بھلی ہے نمبولی ہی کیوں نہ ہو
کچھ تو حدیثِ خیر سمجھنے کے کر جتن
ہر چند بے مزہ مری بولی ہی کیوں نہ ہو

یہ مسئلہ تو حل بخدا کب کا ہو گیا
جو باغ ذنف ہو گیا وہ سب کا ہو گیا

کرنے لگا ہے چاند ستاروں پہ لعن طعن
یہ حوصلہ بھی ماتمِ شب کا ہو گیا

کب تک رہے گا بند یونہی خول سے نکل
بوسیدہ یہ مکان جدِ واَب کا ہو گیا

ہے کوئی خوش گمان تو کوئی ہے بدگمان
کیسا کمال حرف مذبذب کا ہو گیا

کرنے لگا ہے ٹائی لگی ہم سے گفتگو
وہ شخص جب سے شہر مہذب کا ہو گیا

اللہ کی پناہ ٹھہرتی نہیں نگاہ
یہ شاہکار اب مرے مطلب کا ہو گیا

یلغار قلب پر ہے ہمیں دیار کی
ہر شخص کو جنون سا مذہب کا ہو گیا

سارے سخن دھرے کے دھرے رہ گئے وہاں
میں تو رؤف خیرؔ مخاطب کا ہو گیا

وہ خوش سخن تو کسی پیروی سے خوش نہ ہوا
مزاجِ لکھنوی و دہلوی سے خوش نہ ہوا

ملال یہ ہے کہ آخر بچھڑ گیا مجھ سے
وہ ہمسفر جو مری خوش روی سے خوش نہ ہوا

تجھے خبر بھی ہے کیا کیا خیال آتا ہے
کہ جی ترے سخنِ مثنوی سے خوش نہ ہوا

فقیر شاہ نہیں شاہ ساز ہوتا ہے
یہ خوش نظر نگہِ خسروی سے خوش نہ ہوا

سجے ہوئے ہیں ابھی دل میں خواہشات کے بت
یہ سومنات کبھی غزنوی سے خوش نہ ہوا

وہ آدمی ہے جو آبِ حیات کا پیاسا
شرابِ عیسوی و موسوی سے خوش نہ ہوا

وہ کم سخن تو مرا دشمنِ سخن نکلا
غزل سے خوش نہ ہوا مثنوی سے خوش نہ ہوا

اسی کو آیا سر آنکھوں پہ بیٹھنے کا ہنر
جو اپنی حیثیتِ ثانوی سے خوش نہ ہوا

رؤف خیر بھلا تم سے کیسے خوش ہوگا
وہ مولوی جو کسی مولوی سے خوش نہ ہوا

دوچار ہے نئی الجھن سے آج دیوانہ
نہ شہر شہر ہے قریہ نہ ہے نہ ویرانہ

بہیر دل کو بھی ہجرت پہ کر گئی مجبور
پلٹ کے آئے تو خاک وطن نے پہچانا

ہنروروں کے انگوٹھے تراش ڈالے ہیں
نوازشوں پہ جب آیا مزاجِ شاہانہ

حریف سامنے کھل کر کبھی نہیں آتا
رکھیں تو کس سے رکھیں چشمکِ حریفانہ

نظر میں پھرتی ہے شاذ و اریب کی صورت[1]
ہمارے ہاتھ سے اٹھتا نہیں ہے پیمانہ

رؤف خیر اگر ہے سخن کا چسکا ہی
نکالیے کوئی انداز بھی جداگانہ

---

[1] شاذ تمکنت اور سلیمان اریب

تا بکے منزل بمنزل ہم مسافر بھاگتے
آنکھ اب ٹھہری ہوئی ہے اور مناظر بھاگتے

اے حریفِ ہر قدم شہ مات سے بچنے کی سوچ
اِس بساطِ خاک سے کیا ہم سے شاطر بھاگتے

ہم تو آئے ہیں یہاں مٹنے مٹانے کے لئے
اس زمینِ کربلا سے کس کی خاطر بھاگتے

بس ہیں آجانے کا جذبہ بس ہیں کرنے کی ہوس
خاک و باد و آب و آتش بھی ہیں قاصر بھاگتے

سر کہیں پاؤں کہیں آنکھیں کہیں چہرہ کہیں
اس ہوس میں کھو گئی پہچان آخر بھاگتے

خیرِ شب خوں مار کر چھپ جانے والے ہم نہیں
معرکہ سر کرنے نکلے ہیں تو کیا پھر بھاگتے

کھود لیتے ہیں کنواں شہداب پا لیتے ہیں خیر
اس زمینِ سخت سے کیا ہم سے شاعر بھاگتے

گزرتے رُت نے ہمارا خیال رکھا ہے
کہ بوئے خوش خبری سے نہال رکھا ہے
ہمارا ہاتھ ابھی نا آگہی کے ہاتھ میں ہے
اس آگہی نے ہمارا خیال رکھا ہے
ہمیں یہ بھول بھلیاں ڈرا نہ پائیں گی
ہتھیلیوں میں لکیروں کا جال رکھا ہے
لہو ہے گرم تو میدانِ کارزار میں آ
یہ کیا کہ خیمۂ خالی سنبھال رکھا ہے
نمو جو ہے تو سرِ شاخِ زہر پر بھی کھِل
تجھے ہوا نے بہت پائمال رکھا ہے
سماعتوں میں مری حرف جم گئے اُسکے
یہی تو کان میں مال و منال رکھا ہے
وہ میرا بھائی ہے کیا میں بھی اُسکا بھائی ہوں؟
اسی سوال نے اُلجھن میں ڈال رکھا ہے
نکل ہی آئے گا میرا ستارۂ سحری
سوادِ شب نے کسے یرغمال رکھا ہے
یہ حرفِ خیر کوئی دفترِ سیاہ سہی
سخن کے چہرے پہ تِل کی مثال رکھا ہے



ایسا بھی نہیں صرف سرہانے کے لئے ہے
یہ ہاتھ تو یادوں کو بھی جگانے کے لئے ہے

افسوس کہ ہم تشنۂ زہر نہیں ہیں
ہر زہر تو تریاق بنانے کے لئے ہے



ہر چند کچھ علاقہ نہیں شہد کے ساتھ
عبدالرؤف خیر کا عبدالصمد کے ساتھ



خشک لمحوں کے ہیں مارے ہوئے ہم لوگ ہمیں
رات بھیگے تو ضروری تو نہیں سو جانا



دل دکھ نہ جائے بات کوئی بے سبب نہ پوچھ
خانہ بدوش لوگوں سے نام و نسب نہ پوچھ

وہ آ گیا ہے تو اب یہ سوال ٹھہرا ہے
اسے خبر نہ ہو گھر کا جو حال ٹھہرا ہے



اے وہ خوش فہمی سے دامن کو جھٹکنے والے
والہانہ ترے دامن سے لپٹنا کب ہوں

دائرہ بنتا ہوا نقطۂ آغاز ہوں میں
خود میں پھیلی ہوئی آنکھوں میں سمٹنا کب ہوں



ہم کو یہ ضد کہ وہیں پاؤں جمائیں اپنے
جس جگہ کائی بہت اور تماشائی بہت



ہم لیے پھرتے ہیں پہچان ہنرمندی کی
شہر میں نام ہمارا اب و جد سے کب تھا



*

ہمارے قامتِ زیبا پہ حرف رکھتے ہیں
وہ جن کی عمر کٹی آئینے سے ڈرتے ہوئے

بلا سے چیخ بنو حرفِ زیرِ لب نہ بنو
کوئی نشان تو چھوڑو کہیں سے گزرتے ہوئے

*

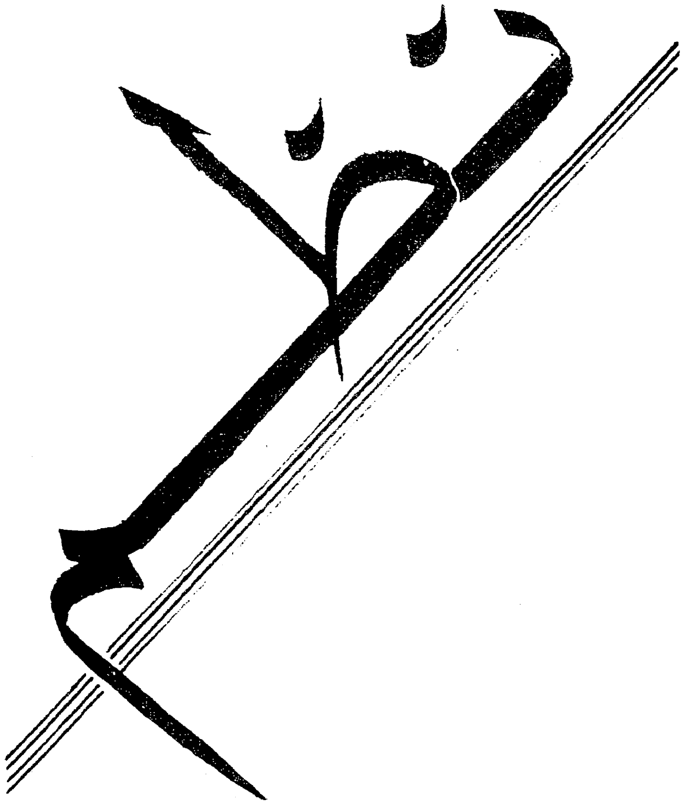
جی رہا ہوں مری بات ادھوری ہے ابھی
ایک بے انت کہانی کی بِنا ہے، میں ہوں

زندگی زہر ترا کام نہ کر پائے گا
جس نے پیتسمۂ زہراب لیا ہے، میں ہوں

*

میں کسے ناراض کس کو خوش کروں
موم کا پُتلا ہوں انگاروں کے بیچ

میں اُسی سِکّے میں ٹوٹا تا بھی ہوں
آئینہ ہوں آئینہ داروں کے بیچ



نمو کا جوش سلامت ہیں بے نشان نہیں
کمال یہ ہے کہ ہر خاک نم ہے میرے لیئے

بین السطور

ابھی سے ہے زینۂ اوّل پہ آفتابِ سحر
میں چل رہا ہوں ادھورا مگر ہے میرا سفر
ہزار جال بچھے ہیں زمیں کے سینے پر

جگہ جگہ ہیں کمیں گاہیں آسمان میں بھی
عجیب طرح کی لذّت ہے امتحان میں بھی
بلا کا جوش بڑا حُسن ہے اُڑان میں بھی

میں اڑ رہا ہوں کہ پرواز نامکمل ہے
نیاز ادھورا ہے اور ناز نامکمل ہے
پہنچ نہ پائے تو آواز نامکمل ہے

بڑی طویل عبارت ضرور ہوتی ہے
جو بات ہوتی ہے بین السطور ہوتی ہے

امانت ـــــ
ـــــ آنے والی ساعتوں کی

ایک پرچھائیں سی ابھری تھی
سرِ غارِ حرائے جاں
کہ جس نے عہدِ جہل لفظ کا ادراک بخشا
عطا کی سارے دہرائے ہوئے لہجوں سے توفیقِ بغاوت

مرے سینے کو چیرا
اپنی بے جسم انگلیوں سے اس میں کوئی چیز رکھ دی
بڑے فرسودہ ذہنوں میں مجھے مبعوث کر کے
امانت سونپ دی سب آنے والی ساعتوں کی
خود کہیں گم ہو گئی

شاپنگ

بے شک تھی شاہکار۔ گلہری میں گھاس تھی
گڑیا نہ لی کہ وہ تو فقط خوش لباس تھی
تصویر بولتی سہی، تصویر ہی تو تھی

چینی کا تاج خوب تھا، ناپائیدار تھا
تھا بادشاہ وقت مگر ہاتھی دانت کا
پیا کھنکھنا تا جسم تھا جو ٹوٹتا رہا

بازار کا جو مال تھا جی کو نہیں لگا
کچھ دیر اور جیب میں سکہ پڑا رہا

پھر یوں ہوا کہ آخر اسے گھر لوٹتے ہوئے
آنکھیں خرید لیں کسی اندھے فقیر سے

وصیّت

یہ واقعہ ہے کہ میں ابن بے اثاثہ ہوں
تمام روئے زمیں جائیداد ہے میری
یہ جائیداد نہایت حقیر ہے پھر بھی
یہ جائیداد ترے نام ہے مرے بیٹے

یہ مشورہ بھی ہے میرا قبول کر لینا
ہمارا باپ نکالا گیا تھا جس گھر سے
میں بک گیا ہوں اُسی جائیداد کی خاطر
وہ گھر کہ جس کی کوئی تولیت نہیں ہوتی
وہ گھر کہ جو کبھی ملتا نہیں وراثت میں
وہ جسم و جاں کے عوض بھی ملے تو لے لینا

ویڈیو گھر

(VIDEO GHAR)

دائیں بائیں آگے پیچھے
کیمرے ہی کیمرے کیسٹ ہی کیسٹ
اک ذرا ہلچل ہوئی اور کیمرے چلنے لگے
اک ذرا آہٹ ہوئی، محفوظ ہو کر رہ گئی
کیمرے کی آنکھ سے بچنا کہاں آسان ہے
ہاتھ کی وارفتگی محفوظ ہے
بے خودی پابستگی محفوظ ہے
آنکھ کی شائستگی محفوظ ہے
سانس کی وابستگی محفوظ ہے
گوش بر آواز وہ کیسٹ بھی ہیں جو
کیمروں میں نصب ہیں
کیمرے میں دن کی اک اک بات ہے
کیمرے کی زد میں ہر اک رات ہے
کیمرے میں پاؤں کی ہر دھج بھی محفوظ ہے
دردِ دل محفوظ بلکہ سوچ بھی محفوظ ہے
ہاں ہوا میں ہاتھ لہراؤ مگر دوسرے کی ناک زخمی مت کرو
اس زمیں پر پاؤں پھیلاؤ مگر پاؤں پر پاؤں کسی کے مت دھرو

شور کرنے کا تمہیں حق ہے مگر
دوسروں کو نیند کا حق بھی تو دو
آف ہوتے ہی نہیں یہ کیمرے
آن رہتے ہیں یہ کیسٹ ہر گھڑی
بھاگ کر اُن سے کہاں تک جاؤ گے
کیمرے میں دن کی اک اک بات ہے
کیمرے کی زد میں ہر اک رات ہے
ری پلے دیکھو
مکر جانے کی اب کوئی بھی گنجائش
کوئی صورت نہیں ہے

کیمرے کی آنکھ کیسٹ کا شکم
شاہد و مشہود اپنے محترم
ہاتھ پاؤں آنکھ پیشانی لب و خسار
سارے جسم میں ہیں کیمرے ہی کیمرے
کیسٹ ہی کیسٹ

تم بجائے خود ہی ہو اک وڈیو گھر
دیکھنا کس کس کو جھٹلاتے رہو گے
کیمرے کی آنکھ سے دامن بچانا ہے محال
ری پلے کو دھیان میں رکھ کر ہنسا کرتے رہو
اپنا حصہ حسن و خوبی سے ادا کرتے رہو

صبحِ کاذب

یہ سچ ہے جھوٹی حکایتیں من گھڑت لطیفے سنانے والے نے یہ کہا تھا
کہ اونٹ کی بازیاں ہی فن ہے
جو شاخِ زیتون شوق سے رقص کر رہی ہے
تمام نابستہ شیر سرکس کے اپنے پنجروں میں جا چکے ہیں
جنابِ دجال ایک مہدی کے روپ میں
گاہ مشرق میں گاہ مغرب میں جلوہ فرما ہیں
ادس او تحریر میں پھر لڑائی ٹھنی ہوئی ہے
فرات گنگا میں مل رہا ہے
نشانِ ہر شہر ہے فلسطین بے نشاں کا
گمان کیا کیا ہے بدگماں کا

پھر اس روایت کے بعد راوی نے یہ بھی چپکے سے کہہ دیا تھا
کہ ذکر اس کا کہیں نہ کرنا
یہ جھوٹ ہے سب یقیں نہ کرنا
اور اس قدر زور کا قہقہہ پڑا تھا
جو دیدۂ تر میں آکے ٹوٹا
یہ سچ ہے

دُوردرشن

سمٹ کے آ گئی دنیا تو چند انچوں میں
ہجوم رنگ و صدا ہے غریب خانے پر
میں دیکھتا رہوں کب تک یہ آنکھ وا کر کے
مکاں کی قید تو الزام ہے زمانے پر
یہاں تو فرصتِ نظارگی کا ماتم ہے

ہٹاؤ ٹی وی کہ کمرہ مرا کُشادہ ہو
ہٹاؤ ٹی وی کہ میں بند آنکھ سے دیکھوں
وہ سین ابھی جو کسی کیمرے کی زد میں نہیں
کمال وہ جو ابھی چینلوں[1] کی حد میں نہیں

CHANNELS

فالوآن

FOLLOW ON

وہ بہو تھی روایتی ــــــــ اکثر
ساس کی جوتیاں بھی کھاتی تھی
جھڑکیاں بھی خسر کی سہتی تھی
اور شوہر سے کچھ نہ کہتی تھی

جبکہ اب ساس بن چکی ہے وہ
صبح اٹھ کر نماز پڑھتی ہے
گھر کے سب کام کاج کرتی ہے
چاروں ایکے بہو کے ہاتھ میں ہیں
اور بیٹا ہے تاش کے گھر میں

خط

میں اس کے نام
سیہ پانیوں میں
ایک کاغذی کشتی
بہا کے دیکھ رہا ہوں
ہوا کا رُخ کیا ہے؟

اک نام

تمہارے سامنے کاغذ پڑا تھا
پین کھلا تھا
بے خیالی میں نہ جانے تم نے کیا کچھ
لکھ دیا تھا

ریگاب

سمندر کے اس پار ریگاب تو ہے
مگر یہ بھی سچ ہے
نمو ہی نمو ہے
میں بنجر زمینوں میں کیا بو رہا ہوں
یہاں واقعی رائیگاں ہو رہا ہوں

اکویریم

AQUARIUM

ایک اکویریم میں بہت پیاری سی مچھلی تھی
پھر جانے کیا ہو گیا
کیسا دھکا لگا
گر کے ٹوٹا وہ اکویریم — پانی سب بہہ گیا
قبل اس کے کہ وہ آخری سانس لے
میں نے اپنی ہتھیلی میں تھوڑا سا پانی لیے
آخری سانس لیتی ہوئی خوبصورت سی مچھلی کو
جینے کا اک حوصلہ تو دیا
پھر تو سچ مچ ہی وہ جی اٹھی
گھر کے کونے میں چھوٹا سا جو حوض تھا
اس کے حق میں سمندر تھا

پھر یوں ہوا — حوض کا پانی گدلا گیا
میں نے سوچا کہ اس خوب صورت سی مچھلی کو
بے حوض کرنے سے بہتر یہی ہے کہ
تالاب میں چھوڑ دوں
وہ صدف جیسی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہ گئی
اور میں اپنی آنکھوں میں موتی لیئے
اس کی آنکھوں کی ہر التجا سے گزرتا گیا

... اور پھر یوں ہوا
گھر کے پیچھے جو تالاب تھا
اس کا پانی بھی سب سڑ گیا
اور پھر اس سے پہلے کہ وہ خوبصورت سی مچھلی
کہیں آخری سانس لے
میں نے اسکو سمندر حوالے کیا
وہ صدف جیسی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہ گئی
اور میں اپنی آنکھوں میں موتی لیے
اس کی ہر التجا سے گزرتا گیا

کل اچانک ملاقات ہونے پہ مچھلی نے مجھ سے کہا
اس سمندر سے بہتر وہ اکویریم تھا
جہاں کم سے کم میری پہچان قائم تھی
پھر وہ صدف جیسی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہ گئی
اور میں اپنی آنکھوں میں موتی لیے
اس کی آنکھوں سے نظریں چراتا ہوا
ٹوٹے اکویریم کی جو کرچیں تھیں
پلکوں سے چنتا رہا

فالو آن (۲)

ایک بدوی نے اٹھایا تھا سوال
آپ کے تن پر امیر المومنین
چادریں دو دو کہاں سے آ گئیں
تب دیا تھا اس کو بیٹے نے جواب
اپنے حصے کی انھیں میں نے ہی دی

دوسرا منظر

اے مرے خیاط میرے دوست سن
کاٹ لوں گا میں یونہی اس سال بھی
میرے بچوں کو نیا ملبوس سی

احیاء

تو خرابوں سے گزرتے ہوئے پیغمبر نے
اُن خرابوں کے مکینوں کا جب احیاء چاہا
خوابِ مرگ آسا ملا
آنکھ کھولی تو یہ دیکھا
خرِ خوابیدہ تھا ریزہ ریزہ
گرم و تازہ تھا مگر زادِ سفر
اور پھر شہر میں سکوں کا چلن بھی بدلا

میں پیمبر نہ سہی
دیدۂ بے خواب کے ساتھ
رات دن ایسے خرابوں سے گزرتا ہوں
جہاں مکڑیاں عشق کیا کرتی ہیں
بھوکے بچوں کو جہاں ممتائیں
دودھ کیا دیتیں فقط کوسا کرتی ہیں
شہر میں عام ہیں کھوٹے سکے

میں پیمبر نہ سہی تو تو خدا ہے اب بھی
اِن خرابوں کے مکینوں کا بھی احیاء ہو جائے

ایک پرچم تلے

چلو اک ذرا جائزہ لے کے دیکھیں
ستارے کہاں سانس لینے رکے ہیں
کہاں سانپ ہیں فاختائیں کہاں ہیں
کہاں ہیں وہ معصوم ہرنوں کی ڈاریں
کہاں بھیڑیے ان کے پیچھے پڑے ہیں
کہاں مچھلیاں بن رہی ہیں غذا مچھلیوں کی
کہاں مکڑیاں جال بُننے لگی ہیں
کہاں مرغیاں اپنے چوزے پروں میں چھپا کر
گِدھوں کے مقابل ڈٹی ہیں
یہ وہ سرزمیں ہے جہاں سانپ بھی
توڑ کر پی رہے ہیں پرندوں کے انڈے

کہاں پا برہنہ چلے جا رہے ہیں
ڈھلانوں سے اٹھ کر پہاڑوں کی جانب
جمی برف میں تخم بارود بونے
کہاں آگ پھیلی ہوئی ہے
کہاں گھر کے گھر جل رہے ہیں
کہاں حُسن کی دیویاں جل رہی ہیں

یہ باپو کی نہرو کی آزاد کی سرزمیں
یہ اہنسا کی وادی
یہ تہذیب کا اک نشاں
علم کا خطۂ بے کراں
مجھے لگ رہا ہے کہ یہ تو لباسوں کا اک شہر ہے
ان لباسوں کے نیچے فقط زہر ہی زہر ہے
لذت حرف سے نابلد
دیکھ کر جن کو حیراں خرد
اُگلتے ہوئے اپنی کالی زبانوں سے کالے حروف
یہ خالی ظروف

ہے شہروں میں جنگل کا قانون نافذ
ہے جنگل بھی مکّار شہری سے عاجز
یہاں اپنے ہی بھائی بندوں کے سینے ہیں چھلنی
مجھے صورت حال ہے یہ بدلنی
میں جھنڈا اٹھائے ہوئے امن کا چل رہا ہوں

چرندوں پرندوں درندوں
سبھوں سے گزارش ہے میری
مرا ساتھ دیں
ایک پرچم تلے چین کا سانس لیں

۴

چہار جانب انہی عناصر کی حکمرانی ہے
کون سنتا مری کہانی
میں اپنی آواز کھو رہا ہوں
وداع اب تم سے ہو رہا ہوں
مگر یہ سن لو ـــ
زبان اک گنگ ہو گئی ہو تو یہ نہ سوچو
کہ اب نہ ٹوکے گا کوئی تم کو
اگر کوئی آنکھ بجھ گئی ہو تو یہ نہ سمجھو
کہ اب نہ دیکھے گا کوئی تم کو
اگر کوئی ہاتھ کٹ گیا ہو تو یہ بھی دیکھو
ہزار ہاتھوں کا ایک جنگل اگا ہوا ہے
ہے پاؤں کوئی جو چھالا چھالا تو یہ تو جانو
کبھی کوئی راہ بے قدم بھی کہیں ہوئی ہے
وہی جیالوں کی بھیڑ سی اک لگی ہوئی ہے

میں اپنی آواز کھو رہا ہوں

میں اپنی آواز کھو رہا ہوں
یہ کن مناظر کا بوجھ آنکھوں پہ ڈھو رہا ہوں
یہ کیسی چیخیں سماعتوں میں سمو رہا ہوں

فضا دکن میں جو معتدل تھی وہ مشتعل ہے
عجیب آندھی ہے برگِ نوخیز ہو کہ برگد
ہے اس کی زد میں
نہیں ہے کوئی بھی اپنی حد میں
بہا چلا جا رہا ہے ہر خواب رد و کد میں

شمال شعلوں میں گھر گیا ہے
کہ ایک چنگاری برف زاروں میں بھی ہے زندہ
جو اپنی خاکستر بدن سے اٹھی تو کتنوں کے سر چڑھی ہے
چھڑے ہیں دیر و حرم کے قصے
نہ دیر سے دیریوں کو اگلا سا پیار
اہلِ حرم بھی اب بے حرم بہت ہیں
وہی انا کے شکار
بے اختیار دونوں

۲

شکارِ مشرق میں مہرِ آشوبِ چشم کا ہے
تمام دن سر پہ خاک ڈالے
وہ سبز منظر بھی لال آنکھوں سے دیکھتا ہے
سفید گھوڑے ہیں کالے بھوتوں کی دسترس میں
سفید پوشوں کے ہیں گریبان چاک
سر پر ہے خاک

بدن میں مغرب کے جو سرایت ہے زہرِ بے نام زخم کا ہے
وہ زخم جس کو سمندری پانیوں سے دھونے کی کوششیں ہو رہی ہیں دن رات
زہر وہ جو رگوں میں پٹرول بن کے گردش کرے
دھماکے کا منتظر ہے
سمندری فیل اک اشارے کے منتظر ہیں کہ روند ڈالیں
ادھر سنبھالے ہوئے ابابیل
اپنی چونچوں میں تشنہ و تابکار کنکر
بساط مشکل ہوئی ہے اک مہرۂ غلط سے
ہیں ایک گھوڑے کی زد میں شاہ و وزیر دونوں
غروب جس سرزمیں میں سورج نہ ہو سکا تھا، وہ دم بخود ہے
اِنھی کو انعام و خلعتِ فاخرہ ملے ہے
جو بربریت کی ایک ننگی مثال ٹھیرے

چھاؤں

والدہ مرحومہ کے نام

وفات ۲۳ ستمبر ۱۹۸۹ء

کسی نے شاخ لگالی ہے اپنے آنگن میں
کسی نے پھول چنے ہیں کسی نے پھل چکھے
کسی نے چھال سے تیری بنالیا صندل
کسی کسی نے تو پتّوں سے گھر سجا ڈالا

تجھے خبر تھی کہ میں ایسا اک مسافر تھا
گھنی گھنی تری چھاؤں میں بیٹھ جاتا تھا
کہ تیری چھاؤں ہی زادِ سفر تھی میرے لیے

کڑی ہے دھوپ بھی لمبا ابھی سفر بھی نہیں
کہاں رکوں مرے رستے میں اب شجر ہی نہیں

پروازِ مشتِ خاک

کہا گیا تھا کہ تیرے ہیں پھول پھل سارے
تمام شہد کے دریا یہ دودھ کی نہریں
کہا یہ میں نے کہ میں کیا کروں یہ نظارے
مزہ تو جب ہے کوئی خوش بدن ہو پہلو میں

تو یوں ہوا کہ بدن کی رفاقتیں بھی ملیں
بدن کے نشے کے آگے کوئی نشہ نہ ٹکا
تمام ذائقے چھوٹے بڑے سبک ٹھہرے

پھر اس کے بعد بہانہ تھا میوۂ ممنوع
عطائے خاص کی صورت مجھے ملا کیا کیا
کہا۔ سنبھال کہ یہ کائنات ہے تیری
یہ جزر و مد یہ سمندر یہ شاخ تر یہ ببول
یہ من و سلویٰ کی بارش یہ مائدہ کا نزول
تمام ذائقے چھوٹے بڑے سبک ٹھہرے
تو پھر یہ پیاز یہ لہسن یہ رتجگے یہ تھکن

کہا یہ میں نے ادب سے کہ اے مرے مالک
یہ کائنات کہاں میں سنبھال کر رکھوں
نظر وسیع مگر جذبۂ قناعت دے
وہ بارِ خورشِ بدن و گوشۂ فراغت دے

کہا یہ اس نے کہ تیری دعا قبول، مگر
وہ اک جنوں کہ جسے کائنات چھوٹی پڑے
ملال یہ ہے کہ دیوار و در میں قید ہوا !

تو یوں ہوا کہ زمین و زماں سنبھال لیا
مکاں سنبھال لیا لامکاں سنبھال لیا

بونوں کا خواب

ساحلی علاقوں پر رہنے والے بونوں نے
ریت کے گھروندوں سے سر نکال کر دیکھا
لمبے چوڑے شہروں کے اونچے اونچے محلوں میں
خوش ادا قد آور بعض لوگ رہتے ہیں
سارے لوگ عزت سے جن کا نام لیتے ہیں
ساحلی علاقوں پر رہنے والے بونوں کے چہرے تمتما اٹھے
جیسے ان کے سینوں میں کوئی پھانس چبھتی ہو

ایک روز بونوں نے جمع اک جگہ ہو کر
فیصلہ یہ فرمایا
ایک ایک قد آور قتل کر دیا جائے

خوش ادا قد آور قتل ہو گئے لیکن
سر کٹا کے بونوں کا قد تو پھر بھی چھوٹا ہے

یارانِ بے وسیلہ

یہ غار، غارِ حرا نہیں ہے
چلے تھے پکنک منانے لے کر شراب کی بوتلیں
اچانک
چٹان نے ڈھک لیا ہے رستہ
کوئی بھی راہ مفر نہیں ہے

آ تو زانی ہے
ب نے مزدوریاں ہڑپ کی ہیں
ج قاتل ہے اپنے والد کا

کسی کے فردِ عمل میں ایسا نہیں ہے کچھ بھی
جسے وسیلہ کریں، دعائے نجات مانگیں
کسے وسیلہ بنا کے راہِ نجات ڈھونڈیں؟

(بخاری شریف کی غار والی حدیث سے استفادہ)

بے اثاثہ

(والد مرحوم کی نذر)

یہ واقعہ ہے کہ میں ابن بے اثاثہ ہوں
نہ کوئی گھر نہ زمیں پائی میں نے ترکے میں
وہ ایک گھر جو تھا پرکھوں کا آخری پندار
ہوا ہے اس پہ بھی اتمام لطف آخر کار

مری شریک نفس ہے تمہاری باقی سانس
لہو تمہارا مرے جسم و جاں میں شامل ہے
تمہارا عشق گناہوں سے روکتا ہے مجھے

یہ ہاتھ خالی نہیں صاحب قلم ہوں میں
یہ آنکھ کاسہ نہیں چشم معتبر ہوں میں
یہ دل سیاہ نہیں نور کا سمندر ہے

مجھے تمہارے وسیلے سے مل گیا کیا کیا
یہ جھوٹ لگتا ہے میں ابن بے اثاثہ ہوں

پناہ

بے تحاشہ دوڑتا ہے
اک سراسیمہ ہرن
اڑ رہا ہے دور تک اسکی چھلانگوں سے غبار
اک شکاری اس کا پیچھا کر رہا ہے دیر سے

خوف کا مارا
پریشاں
تھرتھراتا یہ ہرن
ایک بھوکے شیر کے مسکن میں لیتا ہے پناہ

ہم اپنی رائے کیا ضائع کریں پھر؟

ہم اپنی رائے کیا ضائع کریں پھر
اُسے خود بھی خبر ہے جو ترازو لے کے بیٹھا ہے
کہ ہے پاسنگ اس میں
شیر سرکس کا ہے
ہاتھی بُزدکا ہے
اور کیا سیکل کسی دن واقعی
ایک طیارے سے ٹکرا جائے گی؟
اور کیا — یہ وہی کشتی نہیں ہے
خضر نے جس میں کیا دریا تو پار
اور پھر سوراخ کر کے رکھ دیا
اور کیا یہ وہی انساں نہیں
جو رات بھر سورج کی پوجا کر رہا تھا
اور دن کو ایک چمگادڑ کی صورت
صبح سے لٹکا ہوا ہے
یہ کنول جو گود میں کیچڑ کی ہے
اور کیچڑ ہی مقدر اُس کا ہے

اور کیا۔ یہ وہی سیڑھی نہیں ہے جس پہ چڑھ کے
اپنے ہمسائے کے گھر میں جھانکتے ہیں
یہ وہ ممنوعہ شجر ہے جس کا ہر پھل ہے لذیذ
اور پتے بے ٹھکانہ پھر رہے ہیں

یہ وہی تو وادنٹ ہے
(تخلیق پر جس کی خدا نے فخر فرمایا)
کہ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے

آنکھ والوں کے لیئے یہ اور ایسی ہی کئی آیات ہیں
یہ سب اپنی جگہ فرعون ہیں ۔ خوش ہیں
یہ ہم پر رائے اپنی ٹھونستے ہیں
ہماری رائے کے محتاج بھی ہیں!

ہم اپنی رائے کیا ضائع کریں پھر؟

آنچل

اُلٹ رہا تھا پرانی کتاب کے اوراق
کہ ایک صفحۂ رنگیں مجھے نظر آیا
بہت ہی غور سے میں دیکھتا رہا جس کو
بڑا حسین تخیل تھا اک مصوّر کا

میں محوِ حسن تھا اور انگلیاں چٹختی تھیں
خطوطِ جسم کہ طالب تھے گدگداہٹ کے
نظر کہ مانگ رہی تھی نشانہ ہائے نظر
لبوں کے جام بھی پیاسے لبوں کے طالب تھے

یہ شاہکار تو تھا لیکن اس کا اک پہلو
مرے مذاقِ نظر پر کسی قدر تھا گراں
مجھے لگا کہ ہے محتاج ایک آنچل کا
گلابی جسم کا مغرور سینۂ عریاں

مرا خیال صبا نے بھی جیسے بھانپ لیا
اُلٹ گیا اسی لمحہ کتاب کا صفحہ

مردِ ناداں

مجھے تسلیم ۔ ہیرے کے جگر سے نابلد ہوں
مگر یہ بھی تو دیکھو
تمہارے ہاتھ میں بھی پھول کی پتی نہیں ہے

قابیل

اٹھا کے دیکھئے شاہد ہے آج تک تاریخ
کہ زندگی کا کوئی مرحلہ ہو
بھائی کو شکست بھائی کے ہاتھوں ہوئی ہے
کہ اتنی دیدہ دلیری
پرائے خوں میں کہاں!

ماں / باپ کی قبر پہ

تمہاری قبر کہاں ہے مجھے نہیں معلوم
مگر گمان یہی ہے یہیں کہیں ہوگی
ہوا ہے شہر خموشاں بھی کس قدر آباد
کچھ اور ہی تھا یہ اقبل کچھ ہوا ما بعد
تمہاری قبر پہ کتبہ نہیں نشان نہیں
کہ اس جگہ کی نشانی ہی بے نشانی ہے

یہ وہ مکان ہے جس میں مکیں نہیں رہتا
کہ آسماں کبھی زیرِ زمیں نہیں رہتا

تمہاری قبر پہ کتبہ نہیں تو کیا غم ہے
تمہارا نام رواں ہے مرے رگ و پے میں
تمہارا نام تو زندہ مری زباں پہ ہے

کھڑا ہوں ہاتھ اٹھائے میں آسماں کی طرف
بکھر رہے ہیں اُدھر تتلیاں مرے بچے
چمک رہے ہیں اِدھر میری آنکھ میں جگنو
(اداس ہو گئے بچے مری اداسی سے)

تمہیں خبر ہو دیے سے دیا جلے گا ہی
ہمارے بعد بھی یہ سلسلہ چلے گا ہی

چراغِ مجسّم

آیا کہاں سے لکّہ ٔ یک ابرِ خوش خرام
چپکے سے ڈھول جھونک کے موسم کی آنکھ میں
دریا کے ہونٹ مل گئے صحرا کے ہونٹ سے
ہریالیاں ہیں آہوئے خوش رم کی آنکھ میں
ہے کوئی میگھ دوت کا پیغامِ جاں فزا
یا حرفِ انفعال ہے آدم کی آنکھ میں
صحرائے تشنہ لب پہ جو پانی کی بوند ہے
الماسِ بے بہا ہے وہ عالم کی آنکھ میں
نکتہ نواز ہے وہ سیاہی کی ایک بوند
یا کوئی تل ہے لوحِ مکرم کی آنکھ میں
گرداب ناچتے ہیں سمندر میں، یا شکوک
ہیں بے بساطِ آیتِ محکم کی آنکھ میں
بے معنی تو نہیں ہیں حروفِ مقطعات
ہاں کچھ تو ہے کتابِ مسلّم کی آنکھ میں
یہ حرفِ نارقم، سخنِ ناگزیر ہے
وہ پڑھ، لکھا ہوا ہے جو موسم کی آنکھ میں
رونق حریم کی ہے تو نامحرموں سے ہے
ڈورے ہیں یا کپاس کے ریشم کی آنکھ میں
سورج کی آنکھ میں تو سحر کا جلال ہے
راتوں کا سب جمال ہے شبنم کی آنکھ میں

دھبہ ہے اختیارِ شبِ روسیاہ پر
جو بوند ہے چراغ مجسّم کی آنکھ میں
دیتا ہے کوئی زخم تو کھاتا ہے کوئی زخم
ایک ایک جاں نثار ہے پرچم کی آنکھ میں
لاحاصلی کے کرب سے اٹھتا ہے اک دھواں
آنسو نہیں ہیں خوگرِ ماتم کے آنکھ میں
محشر کے پر سے بڑھ کے نہیں ہے یہ کرّوفر
ٹھیرا ہے جو متاعِ کے دجم کی آنکھ میں
انسان خیرِ جان سبھی کائنات کی
اک ریزۂ خزف ہے جم و خم کی آنکھ میں
مومن دکھائی دے نہ مُہیمن دکھائی دے
لگتا ہے بال پڑ گیا عالم کی آنکھ میں
آتش پرست آگ لگاتے ہیں برف میں
جنّت کھٹک رہی ہے جہنّم کی آنکھ میں
آنکھوں کو انقلاب کا چسکا ہے کیا کریں
سب ڈھیر ہے اصولِ مرتّم کی آنکھ میں
تجھ میں چھپا ہوا کوئی سہراب ہو نہ ہو
آنکھیں ملا کے دیکھ تو رستم کی آنکھ میں
سر ہے تو سر اٹھا کے سدا سرکشوں سے مل
سپنا کوئی نہ پال سرِ خم کی آنکھ میں
قائم ہے خیبر صرف پلک مارنے تلک
جو فاصلہ ہے عزمِ مصمّم کی آنکھ میں

تم کہاں کھو گئے

تم کہاں کھو گئے ہو
مجھے لگ رہا ہے
مرے ٹائپ رائٹر کا اک حرف اے (A)
ٹوٹ کر گر گیا ہے
کہیں کھو گیا ہے
تمہیں کچھ خبر ہے کہ اب میری تحریر
بے ربط سی ہو گئی ہے
تم کہاں کھو گئے ہو

خصی شدہ شیر

اے خصی شدہ شیروں کے خصی شدہ بیٹو
شیرنی تو کیا تم تو لومڑی سے بھی جفتی کر نہ پاؤ گے
شاید آج تک اسی دھوکے میں ہو تم
کہ جنگل کے بادشاہ ہو ۔ لیکن
تم تو زُو میں ہو پیارے

گیت

دور نہ جانا ان انکھیوں سے میرے من کے میت
ٹوٹ نہ جائیں سارے سپنے روٹھ نہ جائیں گیت

تیرے بنا ہر شام اکیلی رات ادھوری ہے
جیون کے ہر پگ پر تیرا ساتھ ضروری ہے
ساتھ نبھاتا ہر رُت میں ٹھیری ہے پیار کی ریت

دور نہ جانا ان انکھیوں سے...

تو ہے تو پھولوں میں خوشبو کلیوں پر ہے روپ
تو ہے تو لگنے لگتی ہے میٹھی میٹھی دھوپ
تو ہے تو ہر مات بھی اپنی لاگے اپنی جیت

دور نہ جانا...

تو میری پہچان ہے ساجن میں تیری پہچان
ہم دونوں اک جان ہیں ساجن تو اتنا تو جان
پریت میں کیسی دوری ساجن دوری میں کیا پریت

دور نہ جانا ان انکھیوں سے...

یک مصرعی نظمیں

★ بہتات

خوشبو کے اضافے سے بھی دم گھٹتا ہے

★ ن ۔ م ۔ راشد

البتہ تم شاعر ہو جاتے لیکن ...

★ سمجھوتہ

شاید تم ہی سچ کہتے ہو

★ قصاص

قصاص لینے کی تم میں ہمت اگر نہیں ہے تو خوں بہا بھی نہ لے سکو گے

★ بیوہ

وہ جو اک ہابیل کی بیوہ تھی اس کا کیا بنا

مضمونِ اوبہ مصرعِ برجستہ تمام
منت پذیر مصرعِ دیگر نمی شود — اقبال

"خود اس شعر میں پہلا مصرعہ کافی ہے"
—— خیر ——

★ **بالآخر**

ثابت ہوا کہ یہ بھی انا کا مریض ہے

★ **اطمینان**

ثابت ہوا کہ اپنے خدوخال ٹھیک ہیں

★ **وہ**

تیری وفا اپنی جگہ وہ بے وفا اپنی جگہ

★ **عشق**

خفا تو ہوتا ہوں، تم سے خفا نہیں ہوتا

★ **سلسلۂ روز و شب**

یہ روز و شب، کوئی بچہ پھرائے جیسے گلوب

★ **بھائی**

وہ میرا بھائی ہے، کیا میں بھی اس کا بھائی ہوں؟

★ **صلہ**

ہنروروں کے انگوٹھے تراش دیتے ہیں

★ ہمسفر

مزہ سفر کا تو بس ہمسفر سے آتا ہے

★ عزت نفس

گزر بھی ہنس کر جو ہوں مبارز طلب اپاہج

★ زاویۂ نظر

اپنی بیوی کو پرائی آنکھ سے بھی دیکھیے

★ توانائیاں

کہاں کہاں نہ توانائیاں تمام ہوئیں

★ کابوس

رات وہ خواب نظر آیا گلا سوکھ گیا

★ اندیشہ ہائے دور دراز

اب کی برسات میں گیلی ہوئی دیوار بہت

★ جائے شکر

پانی کمیاب سہی، شکر ہے کڑوا تو نہیں

★ سفارش

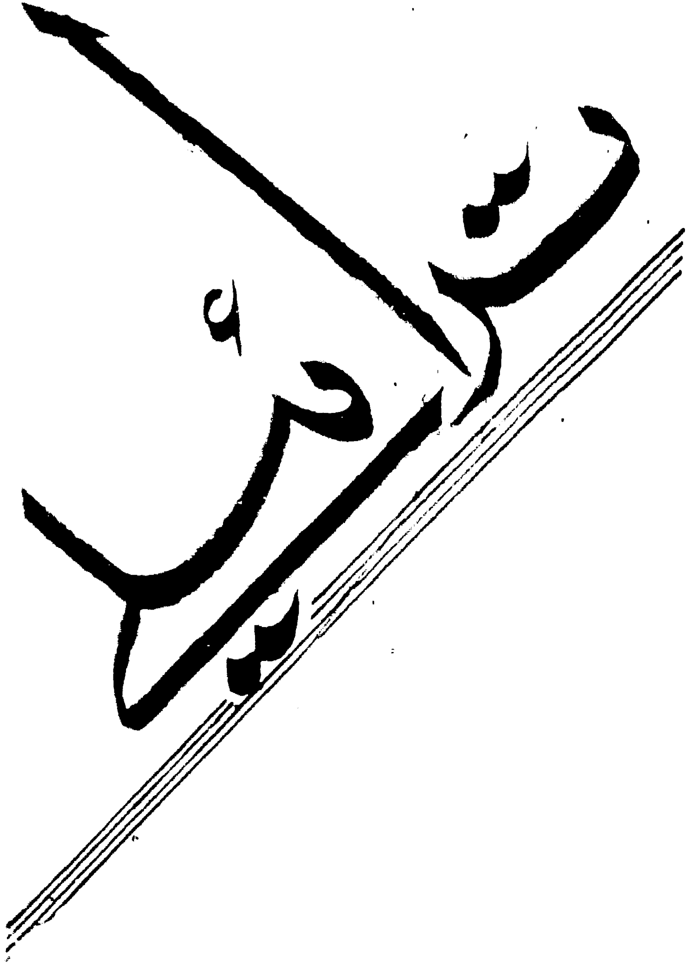
ہر سند سے بڑی سفارش ہے

★ تعلقِ خاطر

میں جانتا ہوں یہ رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے

★ کسر

اک آنچ کی کسر بھی اگر ہو تو ہے بُری



کچھ جہدِ زندگی کی نشانی بھی ہم میں تھی
دنیا سراب تھی تو روانی بھی ہم میں تھی

رہے جو گم شدگی ہم سفر تو اتنی ہو
گزر رہے ہو کہاں سے خبر تو اتنی ہو

*

ہم جو گھر جاتے ہیں چائے نہیں پیتے گھر پر
کھیلتے کودتے بچوں کی ہنسی پیتے ہیں

*

ٹھن گئی ہے یہ کیسی اوس اور خزرج میں
پھر زمین حائل ہے چاند اور سورج میں

*

دنیا سے سر اٹھائے ملوں گا رؤف خیر
ہاں آئینے کے سامنے گردن خمیدہ ہوں

*

میرے شریک جرم مرے یار تم بھی تھے
میں پارسا نہ تھا تو گنہگار تم بھی تھے

تم سے تو خیر کوئی شکایت نہیں مگر
میں خوش گماں تھا اور ملنسار تم بھی تھے

ہائی جیک

یہ کس بدن میں اتار آگیا مجھے لاکے
یہ کون مجھ میں چھپا تھا حریفِ نامحسوس
تُو نے تجھے کیا کیا نہ بین نجیات گئے کھل کے
یہ کس بدن میں اتار آگیا مجھے لاکے
یہ کون ہے جو مجھے یرغمال ٹھہرا کے
ہوا ہے میری طرح اپنے آپ سے مایوس
یہ کس بدن میں اتار آگیا مجھے لاکے
یہ کون مجھ میں چھپا تھا حریفِ نامحسوس

cul de sac

میں عمرِ عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
یہ جانتے ہوئے آگے ہے راستہ مسدود
میں ہار جیت کا قائل ہوں صلح کیسے کر لوں
میں عمرِ عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
جہاں سے ٹوٹنا چاہوں تو ٹوٹ بھی نہ سکوں
نفس کی ڈور ہے سلگی ہوئی بدن بارود
میں عمرِ عشق کی اس رہگذر میں ایک ہی ہوں
یہ جانتے ہوئے آگے ہے راستہ مسدود

کارِ جہاں دراز ہے

آدمی برسرِ بغاوت ہے
قعرِ ارذل سے قصرِ احسن تک

فاصلہ یوں تو بے نہایت ہے
آدمی برسرِ بغاوت ہے

سر سے پا تک جوازِ محنت ہے
من و سلویٰ سے پیاز لہسن تک

آدمی برسرِ بغاوت ہے
قعرِ ارذل سے قصرِ احسن تک

ٹائم کیپسول

بنو امیّہ ہی باقی نہ ہے بنو عبّاس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ

ہوا و حرص بھلا کس کو آسکے ہیں راس
بنو امیّہ ہی باقی نہ ہے بنو عبّاس

سروں میں دفن ہوئی اقتدار کی بو باس
ہر ایک حرفِ ہوس پر کھنچا خطِ تنسیخ

بنو امیّہ ہی باقی نہ ہے بنو عبّاس
نہ اپنے آپ کو دہرا کے تھک سکی تاریخ

دیوار

(اپنے اکلوتے بھائی کے نام)

ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
ایک ہی شہر میں رہتے ہیں غیر بننے کی طرح
اِتنا بودا تو نہ تھا خون کا رشتہ اپنا
اپنی اپنی ہے خوشی درد ہے اپنا اپنا
ہم ہوئے شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح
ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا
ایک ہی شہر میں رہتے ہیں غیر رہنے کی طرح

نو مینس لینڈ

NO MAN'S LAND

یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس سے اپنا کیا کوئی رشتہ نہیں ہے
یہ ہمارے ہاتھ کا لکھا نہیں ہے
یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس کا ہونا پھر بھی کیا ہونا نہیں ہے
اس کی ماں بے شک کوئی سیتا نہیں ہے
یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس سے اپنا کیا کوئی رشتہ نہیں ہے

رنگ ماسٹر

"نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن"
کہ ہم تو سرکس کے جانور ہیں
اشارۂ تازیانہ سے فن
نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن
یہ سب ریاکاریوں کا مامن
یہ ہم اداکار بے نگر ہیں
نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن
کہ ہم تو سرکس کے جانور ہیں

لمبو

میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
ایک آوازِ حق بھی، سمیّہ بھی ہے
گھر کے آنگن ابو جہل کے کج بھی ہیں
میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
چور زانی شرابی ہیں اور زنج بھی ہیں
میں ہوں سب سے الگ سب سے رشتہ بھی ہے
میں جہاں ہوں وہاں اوس و خزرج بھی ہیں
ایک آوازِ حق بھی، سمیّہ بھی ہے

LIMBO

یدِ بیضا

وہ ایک جگنو جسے ہم نے کچھ نہ سمجھا تھا
اسی کے دم سے تھے ہم صاحب یدِ بیضا
اندھیری رات میں اک آسرا تو گویا تھا
وہ ایک جگنو جسے ہم نے کچھ نہ سمجھا تھا
ہمارا کچھ بھی نہیں تھا سب اس کا اپنا تھا
ہمارے ہاتھ میں آکر [illegible] گیا کیسا
وہ ایک جگنو جسے ہم نے کچھ نہ سمجھا تھا
اسی کے دم سے تھے ہم صاحب یدِ بیضا

سِم سِم

اپنا وہ حال تھا اندر بدل گیا
وہ حرفِ مختصر وہ حرفِ راہدر
مہرہ بساطِ بھر چل کر بدل گیا
اپنا وہ حال تھا اندر بدل گیا
لمحہ گزر گیا منظر بدل گیا
اندھے تھے جیسے ہم سِم سِم کو بھول کر
اپنا وہ حال تھا اندر بدل گیا
وہ حرفِ مختصر وہ حرفِ راہدر

25th Hour

کس ساعتِ شدید کے نرغے میں آ گئے
ہر چیز دائرے سے نکلتی ہوئی سی ہے
جنگل کے جتنے شیر تھے پنجرے میں آ گئے
کس ساعتِ شدید کے نرغے میں آ گئے
یہ کس ڈگر پہ جاگتے سوتے میں آ گئے
جو شکل حرزِ جاں تھی وہی اجنبی سی ہے
کس ساعتِ شدید کے نرغے میں آ گئے
ہر چیز دائرے سے نکلتی ہوئی سی ہے

بے مکانی

اس خاک سے ہزار یونہی جی لگائیے
بے آسماں کرکے رہے گی زمین تو
ہر چند سو طرح کا تعلق نبھائیے
اس خاک سے ہزار یونہی جی لگائیے
مٹی سے ہاتھ، ہاتھ سے مٹی چھڑائیے
ہے بے مکانیوں سے ہی شانِ مکین تو
اس خاک سے ہزار یونہی جی لگائیے
بے آسماں کرکے رہے گی زمین تو

نذرِ غالبؔ

محرّف ہو چکیں تورات کی سب آیتیں بھائی
نئے پیغمبروں پر اب نئے سورے اترتے ہیں
جو اپنے دور کے معیار پر پورے اترتے ہیں
نئے معنی دکھاتی ہے نئے لفظوں کی رعنائی

نئی دُھوپوں میں پچھلی رات کے سب خواب روائے
مسائل نور کی ہر بوند پی لینے کے عادی ہیں
اِدھر ہم بھی نئے سورج اگا دینے کے عادی ہیں
کہ ہم ڈرتے ہیں اپنے قد سے بڑھ جائیں نہ یہ سائے

غلط ہے یہ کہ ہم ماضی کی تصویروں سے چڑتے ہیں
مگر یہ سچ ہے اپنا درد اپنا درد ہوتا ہے
ترے لہجے میں اپنا غم سمونا ایک دھوکا ہے
نئے لوح و قلم پیچیدہ تحریروں سے چڑتے ہیں

تو اپنے دور کی آواز تھا یہ مانتے ہیں ہم
مگر جو غم ہے اپنے دور کا پہچانتے ہیں ہم

(سانیٹ)

نذرِ ملٹن

بڑے مزے میں تھا تیئس ۲۳ سال تک ملٹن
غمِ حیات سے جب اسکو ہمسری بھی نہ تھی
مزے کی بات تو یہ ہے خود آگہی بھی نہ تھی
ادا ادا سے نمایاں تھا اس کا بھولا پن

ہوئی نہ تھی ابھی حالات سے شناسائی
نہ گھر کی فکر نہ باہر سے خوف آنا تھا
بڑے سکون سے ہر روز بیت جاتا تھا
ملا نہ تھا ابھی اس کو شعورِ تنہائی

یہاں یہ حال کہ تیئس ۲۳ سال کا عرصہ
پلک جھپکتے تو کیا بیتتا کہ راہوں میں
ہزار موڑ تھے خوں مانگتی پناہوں میں
کٹا ہے جاگتے خواب و خیال کا عرصہ

اُسے ملال رہا دورِ لاشعوری کا
یہاں ملال ہمیں اپنی باشعوری کا

(سانیٹ)